بسم اللہ الرحمن الرحیم

حرف آغاز

خداوند قدوس کا بے پناہ لطف وکرم ہے، اوراس کے لیے ہم بارگاہ رب العزت میں سجدۂ شکر بجا لاتے ہیں، کہ اس رسالے نے پچیس سال کی مدت پوری کر لی ہے، اور اس کی علمی وتحقیقی خدمات کا دائرہ ربع صدی (ایک چوتھائی صدی) پر محیط ہو چکا ہے، پیش نظر شمارے کے طلوع کے ساتھ ہی یہ اپنی زندگی کے چھبیسویں سال میں قدم رکھ چکا ہوگا۔ رسائل ومجلّات کی زندگی کے لیے موجودہ حالات میں یہ ایک معتد بہ مدت ہے، ورنہ اردو زبان میں شائع ہونے والے اکثر رسائل کا یہ المیہ ہے کہ اپنے افق سے نمودار ہونے کے مختصر سے عرصے کے بعد اردو داں طبقے کی چشم پوشی یا نا قدری، یا مطالعہ وکتب بینی کی طرف سے روز افزوں استغنا کی وجہ سے مطلع ہی سے غائب ہوکر ماضی کی یادگار بن جاتے ہیں، مگر الحمدللہ رسالۂ ہذا نے نامساعد حالات کے باوجود پچیس سال کا طویل سفر طے کرلیا ہے، یہ سب اللہ رب العزت کے فضل وکرم سے ہے، ورنہ ہم جیسے حقیر اور بے بضاعت بندوں کی بساط ہی کیا ہے، کہ ناموافق حالات کا سامنا کر کے اپنے وجود کو باقی رکھ سکیں، **والحمدللہ الذی بنعمته وجلاله تتم الصالحات.**

''المآثر'' نے اول روز سے اپنے پیش نظر یہ اصول رکھا ہے، کہ سیاست اور موجودہ سیاسی حالات سے دامن الجھائے بغیر اپنے صفحات کو صرف دین، مذہب ومسلک اور علم وتحقیق کی خدمت کے لیے وقف رکھا جائے، اور وہ اپنے اس فکر ونظریے میں خدا کے فضل سے بہت حد تک کامیاب رہا ہے۔ چنانچہ اس عرصے میں علمی وتحقیقی مضامین ومقالات کے علاوہ بہت سارے رسائل کو شائع کر کے علم ومعرفت کے قدر دانوں کی خدمت میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے، جس کی بدولت اس رسالے کو قارئین کی نگاہوں میں عزت اور ان کے دلوں میں جگہ ملی ہے، اس کے بہی خواہوں کے

تاثرات اور بوقت ملاقات یا بذریعہ فون ان سے گفتگو کے بعد یہ اندازہ ہوتا ہے کہ شائقین کو اس کے شماروں کا خصوصیت سے انتظار رہتا ہے، اور اس کی اشاعت میں اگر کبھی کسی وجہ سے تاخیر ہو جاتی ہے، تو ان کے دلوں میں اضطراب اور بے چینی پیدا ہونے لگتی ہے۔ قارئین کے اس استحسان و پسندیدگی، اور قدر دانی وحوصلہ افزائی کے لیے ادارہ ان کا مشکور ہے، ان کی یہ پسندیدگی وقدر دانی ہی ہے کہ اپنی علمی بے مائیگی اور مادی بے سروسامانی کے باوجود کار پردازان ادارہ رسالے کو جاری رکھنے پر اپنے دلوں کو مجبور پاتے ہیں، اور علم دوست ناظرین سے بقدر امکان تعاون کی امید کرتے ہیں۔

یوں تو ''المآثر'' نے سیاست اور سیاسی گفتگو سے اپنے دامن کو حتی الامکان بچا کر رکھا ہے، لیکن روئے زمین پر پیش آنے والے واقعات سے کبھی آنکھیں بند نہیں کی ہیں، اور عالمی سطح پر مسلمانوں کو درپیش مشکلات ومسائل میں اپنے کرب کے اظہار کے ساتھ ساتھ حق بات کہنے اور صحیح سمت میں ان کی رہنمائی کی کوشش کی ہے۔ اس کی یہ کوشش رہی ہے کہ ایسی تحریریں اور نگارشات منظر عام پر لائی جائیں جن سے پڑھنے والوں کے قلوب میں اسلام اور تعلیمات اسلام سے محبت پیدا ہو، دینی بیداری آئے، مذہب ومسلک کی اہمیت کا احساس بیدار ہو، علم وتحقیق میں اضافہ کا باعث بنیں، بنی نوع انسان خصوصاً اہل اسلام کے ساتھ محبت اور ہمدردی وغم گساری کا جذبہ پروان چڑھے۔

....

اس وقت عالمی سطح پر مسلمانوں پر جو مصیبت وافتاد ہے، اس سے کوئی سنگدل سے سنگدل مسلمان بھی نہیں ہوگا، جو تڑپ نہ رہا ہو اور اس کا دل خون کے آنسو نہ روتا ہو۔ بخاری ومسلم کی حدیث ہے جسے حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سن کر بیان کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
مَثَلُ الْـمُؤمِنِينَ فِي تَوادِّهِمْ وَتَراحُمِهِمْ وتعاطُفِهِمْ مِثْلَ الْجَسَدِ، إذا اشْتَكىٰ مِنه عُضوٌ تَـداعَـى لَـهُ سَائِرُ الْجَسَدِ بِالسّهر والحُمَّى (مسلمانوں کی باہمی محبت، آپسی ہمدردی اور ایک دوسرے کے ساتھ رحم دلی کی مثال ایک جسم کی طرح ہے، کہ جب جسم کا ایک عضو بیمار ہوتا ہے تو پورا جسم بخار اور بیداری میں مبتلا ہو جاتا ہے)۔

دنیا کے مختلف ممالک اور متعدد علاقوں میں مسلمان اس وقت نہایت بے بسی، بے کسی اور مصیبت وپریشانی کی زندگی گزار رہے ہیں، جن میں فلسطین، شام اور برما سرفہرست ہیں، ان ملکوں

کے مسلمانوں پر ظلم وستم کے واقعات سے روزانہ اخبارات کے صفحات سیاہ نظر آتے ہیں، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہاں کے مسلمانوں پر ہر صبح وشام ظلم کی ایک نئی تاریخ رقم ہوتی ہے۔

تاہم حالیہ رونما ہونے والے واقعات میں سب سے دل دوز اور خوں چکاں واقعہ شام کے اہم ترین شہر حلب کے سقوط اور وہاں کے باشندوں کے انخلا کا ہے، حلب ملک شام کا انتہائی قدیم شہر ہے، جس کی تاریخ حضرت عیسی علیہ السلام سے ہزاروں سال پرانی ہے۔ یہ دارالحکومت دمشق سے شمال میں واقع ہے، اور تاریخی وجغرافیائی اعتبار سے نہایت اہمیت کا حامل ہے، حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں شام کی فتوحات کے ساتھ یہ شہر اسلامی قلم رو میں داخل ہوا تھا، مسلمانوں کے لیے یوں بھی یہ شہر نہایت اہمیت رکھتا ہے کہ یہ علماء، صلحاء، محدثین اور بزرگوں کا گہوارہ رہا ہے، بڑے بڑے اہل علم وفضل اور باکمال لوگ اس کی آغوش میں پلے بڑھے ہیں، اسلامی تمدن اور تہذیب وثقافت کے اہم مراکز میں سے یہ شہر رہا ہے، اس وقت شام میں سنی مسلمانوں کا ایک مضبوط قلعہ یہ شہر تھا، جس کو اسلام اور مسلمانوں کے دشمنوں نے مل کر زمیں بوس کر دیا، شام کی شیعہ حکومت، شیعہ ایران اور روس کی کمیونسٹ اسلام دشمن طاقتوں نے حلب کی اینٹ سے اینٹ بجادی، اور اس کے نتیجے میں وہاں کے سنی مسلمانوں پر کیسی قیامت گزری ہوگی، اس کے بارے میں نہ تفصیلات ہیں اور نہ ہم صحیح اندازہ کر سکتے ہیں، لیکن یہ اندازہ ضرور ہے کہ وہاں کے مسلمانوں کو صفحۂ ہستی سے نیست ونابود کرنے میں شاید کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا گیا ہوگا۔

عالمی سطح پر مسلمانوں کے موجودہ حالات کے پیش نظر بس اہل اسلام سے یہ درخواست کی جاسکتی ہے کہ وہ وقت اور حالات کو سمجھیں، اپنی غفلتوں اور کوتاہیوں کو ترک کریں، خداوند قدوس کی بارگاہ میں سجدہ ریز ہوں، اسلام کے سچے ماننے والے بنیں، اور اپنے ملک کے ساتھ ساتھ پورے عالم کے مسلمانوں کے حق میں دعا کریں، مسلمانوں کے پاس اس کے سوا اس وقت کوئی حربہ اور چارہ نہیں ہے۔

ماخوذ: از تفسیر عزیزی

(مسلسل)

تفسیر سورۂ انشقاق

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اِذَا السَّمَاءُ انْشَقَّتْ o

جب آسمان پھٹ جائے

حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے مروی ہے کہ آسمان کہکشاں کے مقام سے پھٹے گا۔

آسمان کے پھٹنے کی وجہ:

آسمان اس وجہ سے پھٹے گا کہ، اس دن وہ فرشتے جو مخلوق کا رزق اتارنے، بندوں کے اعمال اوپر لے جانے کے لیے آسمان کے دروازوں پر مقرر ہیں وہ اس کام سے فارغ ہو جانے کی وجہ سے نیچے اتر آئیں گے، اور دوسرے فرشتے بھی حشر کے میدان میں اتر کر صفیں باندھ کر کھڑے ہو جائیں گے، تب قہر الٰہی کی تجلی عرش پر غالب ہو کر اس کو نیچے کی جانب دبائے گی، اس تجلی کے دباؤ وصدمے سے اور عرش کے بوجھ سے آسمان پاش پاش ہو جائے گا۔

اور یہ وجہ بھی ہے کہ اس دن ایک نئے عالم کی تعمیر مدِ نظر ہے، اس لیے پہلے عالم کی تخریب ضروری ہوئی، کیونکہ سابق بنی ہوئی چیز کی تخریب کے بغیر اس کی جگہ نئی تعمیر نہیں ہوسکتی۔

درسِ عبرت:

یہاں یہ سمجھ لینا چاہئے کہ کہ انسان دو چیزوں سے مرکب ہے۔(۱) روح (۲) جسم

انسان کی روحانیت کا مرکز ومنشاء آسمان ہے، اس لیے کہ اس کا نفس ناطقہ نفوسِ سماویہ سے ماخوذ اور ان سے کامل مشابہت رکھتا ہے، اور اس کی ''روح ہوائی'' جو نفس کے ساتھ مرکب اور گوشت پوست کے بدن میں سرایت کیے ہوئے ہے، اس کا جوہر بھی آسمان کے جوہر کے ساتھ کلی مشابہت

رکھتا ہے کہ ٹوٹنے پھوٹنے کو قبول نہیں کرتا (سوائے اللہ کے حکم کے) یہ روح اگرچہ بیماریاں اور بڑے بڑے صدمات اٹھاتی ہے، مگر بالکل فنا نہیں ہوتی، اس کے فنا کی انتہا یہ ہے کہ بدن سے جدا ہو جاتی ہے، پھر ارواح کے نگراں ومحافظ فرشتوں کے پاس محفوظ رہتی ہے۔

اور روح کی سعادت وشقاوت جس کو عرف میں بخت (نصیب، قسمت) کہتے ہیں اور طالع کی طرف بھی منسوب کرتے ہیں، اس کا سبب بھی آسمان وستاروں کی حرکات کی مختلف اوضاع ہیں۔

اور روح کی غذا اس کی بیماریوں کی دوا جو شریعت وطریقت کی صورت میں ہے یہ بھی آسمان سے نازل شدہ ہے۔

لہٰذا آسمان کا پھٹنا اس بات کی قوی ومضبوط ترین دلیل ہے کہ انسان کی روحانیت کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے بغیر چارۂ کار نہیں ہے، کیونکہ آسمان جو اس روحانیت کا مرکز ہے وہ اپنی تمام تر عظمت وبلندی کے باوجود اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری سے نہیں نکل سکتا۔

پھر یہ آسمان کا پھٹنا اس وجہ سے نہ ہوگا کہ آسمان کی بنیاد وتعمیر میں کچھ کمزوری ہے، جیسا کہ دنیا کی عمارتوں میں ہوتا ہے، بلکہ اس کی قوت، مضبوطی اور سختی کے باوجود اللہ کے حکم کی تابعداری میں ایسا ہوگا، چنانچہ فرماتے ہیں:

وَاَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ ○

اور سن لے حکم اپنے رب کا اور وہ آسمان اسی لائق ہے

یعنی یہ حکم جو نہایت شاق تھا آسمان نے سنتے ہی اس کی تابعداری کی، اس حکم کے ماننے میں ذرہ بھر سرکشی نہیں کی، اور آسمان کی یہ فرمانبرداری ایسی نہیں ہے کہ اس کی عظمت وبلندی کے منافی ہو، بلکہ یہ تذلیل وعاجزی اس کی عظمت کے مناسب ولائق ہے۔

و اِذَا الْاَرْضُ مُدَّتْ ○

اور جب زمین پھیلا دی جائے

یعنی جب زمین کھینچ کر لمبی چوڑی کردی جائے گی تاکہ اس دن جو مجمع عظیم ہوگا اس کی جگہ ہو سکے، اس میں ساتوں آسمان کے فرشتے، حاملینِ عرش، تمام مخلوقات، جن، انسان ان کے پچھلے

سب اس وقت جمع ہوں گے۔

دوسرے اس لیے بھی زمین کو کھینچ کر لمبا چوڑا کیا جائے گا تا کہ زمین ہموار ہو جائے، اس میں عمارتیں، ٹیلے، پہاڑ وغیرہ جو ہیں وہ سب برابر ہو جائیں، تا کہ کھڑے ہونے والے سب برابر اور ایک دوسرے کے سامنے ہوں، کوئی کسی چیز کی آڑ میں نہ ہو، سب ایک دوسرے کے حال کو دیکھ سکیں۔

اس بات کا مشاہدہ کسی بچھونے کے کھینچ کر اور پھیلا کر بچھانے میں ہوتا ہے کہ اس سے دو فائدے حاصل ہوتے ہیں۔(۱) یہ کہ وسعت اور گنجائش پیدا ہو جاتی ہے۔ (۲) یہ کہ ہمواری پیدا ہو جاتی ہے۔

جسم کو اللہ کی نافرمانی سے بچانے کا فطری تقاضا:

زمین انسان کے جسم کا منشاء و مرکز ہے، اس کے جسم کا غالب حصہ زمین سے ماخوذ ہے، جسم کی غذا اور بہت سے منفعتیں زمین سے ہی حاصل ہوتی ہیں، لہٰذا زمین کا اللہ کے حکم کے سامنے مطیع وفرمانبردار ہونا اس بات کی قوی دلیل ہے کہ انسان اپنے جسم کے تمام اعضاء رگ و ریشے کو اللہ کے حکم کا مطیع وفرماں بردار رکھے۔

وَاَلْقَتْ مَا فِيْهَا وَتَخَلَّتْ ۝

اور نکال ڈالے جو کچھ اس میں ہے اور خالی ہو جائے

یعنی پھیلا دینے کے لیے زمین جب کھینچی جائے گی تو کھینچنے کی وجہ سے زمین اپنے خزانے، دفینے، کانیں اور مُردوں کے اجزاء اُگل دے گی تا کہ انسانوں کا حشر تمام اجزاء کے ساتھ حاصل ہو، اور زمین سے حاصل ہونے والے جن منافع کی وجہ سے لوگ قتل وقتال کرتے ایک دوسرے کی حق تلفیاں کرتے تھے، ان منافع کی کامل ذلت و بے قدری لوگوں کے سامنے ظاہر ہو سکے۔

اور زمین انسانوں کے تمام آثار و اعمال سے بہ تکلف خالی کر دی جائے گی تا کہ اس کے مطابق ان کو جزا دی جا سکے۔

اور زمین کا اپنے دفینوں کا اگلنا، اور خالی ہو جانا کسی ذاتی فائدے، یا بدلے کی لالچ میں یا ضرر کے خوف سے نہ ہوگا، بلکہ فرمانِ الٰہی کی وجہ سے وہ ایسا کرے گی۔

وَاَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ○

اور سن لے حکم اپنے رب کا اور وہ زمین اسی لائق ہے

یہاں یہ سمجھ لینا چاہئے کہ اکثر عوام یہ سمجھتے ہیں کہ یہ آیت مکرر ہے مگر ایسا نہیں ہے، پہلی بار آسمان کے متعلق ہے اور یہاں زمین کے متعلق ہے۔

"إذا" کی جزاء:

إذا شرطیہ کی جزا محذوف ہے، یعنی جب آسمان وزمین نے اللہ تعالی کی ایسی فرماں برداری اختیار کی، تو اے انسان تجھ پر صریح الزام وحجت قائم کی جائے گی کہ تُو کس وجہ سے روحانی جسمانی ہر اعتبار سے اللہ کا نافرمان ہو گیا اور ساری عمر اللہ کے حکم کی مخالفت میں گذار دی، چنانچہ الزام حجت کو بیان کرنے کے لیے واضح طور پر فرماتے ہیں:

یٰٓاَیُّهَا الْاِنْسَانُ اِنَّکَ کَادِحٌ اِلٰی رَبِّکَ کَدْحاً

اے آدمی تجھ کو تکلیف اٹھانی ہے اپنے رب تک پہنچنے میں سہہ سہہ کر

یعنی اے انسان! تو آسمان سے بڑا ہے نہ زمین سے زیادہ سخت کہ اپنے پروردگار کی اطاعت نہ کرے، اور یہ بھی ہے کہ تجھے جو حکم دیا گیا ہے وہ آسان ہے اور زمین وآسمان کو جو حکم دیا گیا وہ نہایت ہی مشکل ہے، مگر باوجود اس کے انھوں نے حکم بجالانے میں روگردانی نہیں کی، اور نہ ہی زمین وآسمان کو کسی عذاب یا ثواب کی توقع ہے، لیکن تمھیں جو حکم دیا گیا ہے اس کے نتیجے میں عذاب یا ثواب بھی متوقع ہے، کیونکہ "انک کـــــادح" الخ تُو تو اپنے پروردگار کا قرب حاصل کرنے کے لیے کمال مشقت سے کوشش کرنے والا ہے، اس لیے کہ تجھے وصول کی استعداد بھی عطا فرمائی ہے اور دماغ میں بھی اس کی دھن رکھی ہے، مگر آسمان وزمین میں وصول کی استعداد ہے اور نہ اس کا کچھ خیال ہی ہے۔

اور جس وصول اور بے پردہ دیدار کا تجھ سے وعدہ کیا گیا یہ محض خیالی نہیں ہے جس پر تو دنیا میں خوش تھا، بلکہ واقع میں ایسا ہونے والا ہے، چنانچہ فرمایا:

فَمُلٰقِیْهِ○

پھر اُس سے ملنا ہے

یعنی اپنے رب سے بغیر خیال وادراک کے پردے اور بغیر نمونہ ومثال کے پردے کے ملاقات کرے گا، لہٰذا اللہ کے حکم کی تابعداری کی جتنی تجھے ضرورت ہے اتنی کسی اور مخلوق کو نہیں ہے تاکہ اس دن عین ملاقات وحضوری کے وقت تجھے شرمندگی نہ اٹھانی پڑے، کیونکہ قرب کے مراتب حاصل کرنے کے لیے تُو نے جیسی بھی کوشش کی ہوگی کمزور یا طاقتور وہ سب ظاہر ہوجائے گی، اور یہ کوشش کا ظہور جس طرح ہوگا اس کو بیان فرماتے ہیں:

فَاَمَّا مَنۡ اُوۡتِیَ کِتٰبَهٗ بِیَمِیۡنِهٖ٥

سو جس کو ملا اعمال نامہ اُس کا داہنے ہاتھ میں

یعنی پروردگار کی ملاقات کے وقت جس کو اعمال نامہ دیا جائے گا کہ جس میں اس کی بہترین کوشش، اللہ کے احکام کی فرماں برداری لکھی ہوگی تاکہ جس بات کو شوق میں حکم بجالایا تھا اس کی خوشی ولذت اسے حاصل ہو اور یہ جان لے کہ میری کوشش ٹھکانے لگی ہے۔

اور اعمال نامہ دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا کہ یہ نجات ورضامندی کی علامت ہے، کیونکہ اکثر دایاں ہاتھ بائیں ہاتھ پر غالب ہوتا ہے، اس نے بھی اللہ کے حکم کی اطاعت کی اور نفس کی خواہشوں پر غالب آیا، ایک عظیم قوت حاصل کی، اور نیکیاں برائیوں پر غالب ہوگئیں۔

فَسَوۡفَ یُحَاسَبُ حِسَاباً یَسِیۡرًا٥

تو اس سے حساب لیں گے آسان حساب

اعمال نامے سیدھے ہاتھ میں دینے کے بعد ان برے کاموں کا آسان حساب لیا جائے گا جو نیکیوں کے مقابلے میں مغلوب اور تھوڑے سے رہ گئے تھے۔

حدیث میں آیا ہے حضرت اُم المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا یا رسول اللہ! ''حساب یسیر'' کیا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حساب یسیر یہ ہے کہ بندے کو اس کا نامۂ اعمال دکھایا جائے گا اور آواز آئے گی اے میرے مسلمان بندے تو نے میری جو بندگی کی میں نے قبول کی اور جو غلطیاں تجھ سے ہوئیں بخش دیں، کسی بات پر لے دے اور مناقشہ نہ ہوگا کہ یہ کیوں کیا؟ یا اس طرح کیوں کیا؟

فرمایا"**فاما من نوقش في الحساب عذب**" جس سے پوچھ گچھ اور مناقشہ شروع ہو گیا وہ مصیبت میں پڑ گیا، اس لیے کہ کوئی شخص گناہ کا کوئی عذر رکھتا ہے نہ گناہ سے خالی ہے۔

یوں بھی روایت ہے کہ ایک دن رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، جس سے حساب لیا جائے گا وہ تو عذاب میں گرفتار ہو جائے گا، اس پر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کیا اللہ تعالیٰ نے یوں نہیں فرمایا "**فسوف يحاسب حساباً يسيراً**" اس آیت سے تو معلوم ہوتا ہے کہ مومن لوگ حساب کے بعد نجات پا جائیں گے، نبی کریم ﷺ نے فرمایا یہ محض اعمال کا دکھانا ہوگا (پیشی ہوگی) کہ تم نے یہ کیا ہم نے معاف کیا، فلاں کام نہیں کیا ہم نے درگذر کیا، میری مراد حساب سے مکمل جانچ پڑتال، تحقیق وتفتیش ہے سو یہ معاملہ جس سے ہو گیا وہ تو ہلاک ہو گیا۔

وَيَنْقَلِبُ اِلٰٓى اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا○

اور پھر کر آئے گا اپنے لوگوں کے پاس خوش ہو کر

خوش خوش اپنے گھر والوں کی طرف لوٹے گا، نہ عذاب کا ڈر رہا نہ غصے یا جھڑکی کا خوف وشرمندگی، نجات مل جانے کی خوشی جب اپنے گھر والوں کے ساتھ ملنے کی خوشی کے ساتھ جمع ہوگی تو اس کو راحت ولذت، سرور وفرحت کی ایسی عجیب کیفیت حاصل ہوگی کہ جس کے مقابلے میں کوئی راحت وخوشی نہیں ہے۔

أهـلـه:- اہلِ خانہ سے مراد ہے جنت کی حوریں جو اس کو ملیں گی اور دنیا کی بیویاں جو جنتی ہوں گی اور اس کے دیگر احباب ورشتہ دار جو اس کے حساب وکتاب کی اطلاع پانے کے لیے حشر میں منتظر کھڑے ہوں گے۔

بندے پر دو غم مسلط نہیں ہوتے:

یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا اللہ تعالیٰ اپنے بندے میں دو غم جمع نہیں کرتا، دنیا میں جس نے دین کا غم کھایا وہ اس دن خوش ہوگا۔

سَوْفَ لانے میں نکتہ:

''سوف'' تراخی اور مہلت کے لیے آتا ہے، یہاں ''سوف'' لا کر اس طرف اشارہ فرمایا کہ

نیک بندے کو سب سے پہلے دائیں ہاتھ میں اعمال نامہ دے کر خوش کریں گے، پھر کافی عرصہ کے بعد اس کو برائیوں پر بھی مطلع فرمائیں گے تاکہ شروع میں ہی برائیوں سے مطلع ہو کر شرمندہ و پشیمان نہ ہو۔

وَاَمَّا مَنْ اُوْتِیَ کِتٰبَهٗ وَرَآءَ ظَهْرِهٖ○

اور جس کو ملا اُس کا اعمال نامہ پیچھے سے

الٹے ہاتھ میں اعمال نامہ دینا ہلاکت و بربادی کی علامت ہے (اور نکتہ اس میں یہ ہے کہ) الٹا ہاتھ چونکہ سیدھے ہاتھ کے مقابلے میں کمزور ہوتا ہے سو اس نے بھی زندگی میں ضعیف جانب یعنی خواہشاتِ نفسانی کی جانب کو قوی جانب پر مقدم کیا تھا، یعنی اللہ تعالیٰ کی فرماں برداری قوی جانب ہے، اس نے اس جانب کو نظر انداز کیا اور ضعیف پہلو کو اہمیت دے کر قوی کیا اور قوی کو ضعیف کیا گویا اس نے معاملہ الٹا کیا، اسی لیے اس کو بھی اعمال نامہ الٹے ہاتھ میں دیا گیا۔ (گویا اس کو الٹے ہاتھ میں اعمال نامہ تھمانا اس کے دنیا میں طرزِ عمل کی تمثیل ہے)

اور اعمال نامہ سامنے کی طرف سے اس کو نہیں دیا جائے گا چونکہ اس کے ہاتھ پیچھے بندھے ہوئے ہوں گے اس لیے پیچھے سے اس کو اعمال نامہ دیا جائے گا۔

فَسَوْفَ یَدْعُوْا ثُبُوْرًا○

سو وہ پکارے گا موت موت

یعنی آرزو کرے گا کاش موت آجائے اور میں اپنے برے کاموں کی سزا سے نجات پاسکوں۔

"سوف"، میں نکتہ:

"سوف" تاخیر پر دلالت کرتا ہے، یہاں اس کو اس لیے لائے ہیں کہ فوراً اس کو اپنی بربادی کا یقین نہیں ہوگا، بلکہ اپنی زندگی کی تمام کارگذاری کا تفصیل کے ساتھ جائزہ، جانچ پڑتال اور تحقیق کے بعد ہوگا، پہلے مرحلے میں تو جب اچھے برے، ملے جلے اعمال دیکھے گا تو وہ سوچنے لگے گا شاید میرے نیک اعمال برائیوں پر غالب آجائیں اور میری نجات ہوجائے، سو اعمال کا تفصیل کے ساتھ جائزہ و مطالعہ اس کے لیے مہلت اور کچھ وقفہ درکار ہے اسی لیے "سوف" لائے ہیں۔

سورۂ حاقہ کی آیت اور سورۂ انشقاق کی آیت کے درمیان تعارض نہیں ہے:

سورۂ حاقہ اور بعض دوسری سورتوں میں جو یہ بات بیان کی گئی ہے کہ بعض لوگوں کو اعمال نامہ دائیں ہاتھ میں اور بعض کو بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا، یہ اس کے منافی نہیں کہ بائیں ہاتھ میں پیٹھ پیچھے سے دیا جائے گا جیسے اس آیت میں ہے، کیونکہ بائیں ہاتھ میں اعمال نامہ دینے کی صورت یہی ہوگی کہ پیٹھ پیچھے سے دیا جائے گا۔

اعمال نامے حاصل کرنے کی کیفیت کے متعلق بعض مفسرین پر ردّ:

بعض مفسرین نے بیان کیا ہے کہ اس دن لوگ تین طرح کے ہوں گے:

(۱) نجات پانے والے، ان کو دائیں ہاتھ میں اعمال نامے دیے جائیں گے۔

(۲) دائمی ہلاکت والے، ان کو الٹے ہاتھ میں اعمال نامے دیے جائیں گے۔

(۳) وہ لوگ جن کو عذاب کے بعد نجات ہوگی، ان کو سیدھے ہاتھ میں پیٹھ پیچھے سے اعمال نامے دیے جائیں گے، یا ابدی ہلاکت والوں کو پیٹھ پیچھے سے بائیں ہاتھ میں اعمال نامے دیے جائیں گے اور عذاب کے بعد نجات پانے والوں کو الٹے ہاتھ میں سامنے کی طرف سے اعمال نامے دیے جائیں گے۔

یہ قول قرآن وسنت کے مطابق نہیں محض احتمال ہے، اس لیے کہ اہل شمال (بائیں ہاتھ والے) اور اہلِ ظہر (پیٹھ پیچھے والے) کے بارے میں جو وعیدیں آئی ہیں وہ قریب قریب ایک ہی طرح کی ہیں وہ ان میں سے کسی کے حق میں نجات یا خلاصی کی نشاندہی نہیں کرتیں (جس سے معلوم ہوا کہ یہ دونوں الگ الگ قسمیں نہیں ایک ہی قسم کے لوگوں کو دو مختلف ناموں سے ذکر کیا گیا ہے)

اس کے علاوہ بعض احادیث میں اعمال نامے دینے کی صورت کی اسی طرح تصریح آئی ہے جیسے آیت کے ذیل میں بیان ہوئی ہے۔ واللہ اعلم

جب یہ بات بیان فرمادی کہ پیٹھ پیچھے اعمال نامہ دیا جانا دوزخی ہونے کی علامت ہے، جب وہ شخص یہ جان لے گا تو فریاد وشور مچائے گا، اپنی ہلاکت وموت کو پکارے گا، اب یہ ارشاد فرماتے ہیں کہ اس کی اس جزع فزع، بے تابی وبے قراری، اور اضطراب وپریشانی پر ہی بس نہ ہوگی، بلکہ جس چیز سے وہ ڈرتا تھا اس میں اس کو گرفتار کیا جائے گا، چنانچہ فرمایا:

وَيَصْلٰی سَعِيْرًا ○ اِنَّهٗ كَانَ فِيْۤ اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا ○

اور پڑے گا آگ میں وہ رہا تھا اپنے گھر میں بے غم

دنیا میں اپنے گھر والوں کے درمیان خوش وخرم اور بے غم تھا، نہ دنیا کا غم تھا نہ آخرت کا، کفر وگناہ سے ہی ڈر تھا نہ اللہ کی رضا مندی کی طرف کچھ توجہ تھی۔

یہاں سے معلوم ہوا کہ دنیا کی خوشی کے پیچھے آخرت کا غم چھپا ہے، چنانچہ دوسری جگہ فرمایا ”فَلْيَضْحَكُوْا قَلِيْلاً وَّلْيَبْكُوْا كَثِيْرًا“ جس نے دنیا میں آخرت کا غم کھایا وہ ہمیشہ کی خوشی ومسرت پائے گا۔

ہر خوشی مذموم نہیں:

یہاں یہ بھی سمجھ لینا چاہئے کہ دنیا میں وہی خوشی مذموم ہے جو غفلت، خوش حالی وآسودگی سے پیدا ہو، ورنہ جو خوشی اللہ کے حکم پر راضی رہنے کی وجہ سے حاصل ہو یا دین کے مراتب عالیہ حاصل ہونے کی وجہ سے حاصل ہو وہ سراسر محمود ونافع ہے، چنانچہ سورۂ یونس میں فرمایا: ”قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا“ اور جس خوشی کو سورۂ انشقاق میں (محل ذم) میں بیان فرمایا ہے اس سے یہی خوشی مراد ہے جو غفلت کی وجہ سے ہو، چنانچہ صاف فرمادیا:

اِنَّهٗ ظَنَّ اَنْ لَّنْ يَّحُوْرَ ○

اس نے خیال کیا تھا کہ پھر کر نہ جائے گا

وہ یہ گمان کرتا تھا کہ دوبارہ عالم ارواح کی طرف لوٹایا نہ جائے گا، اور اپنے اعمال کا حساب نہیں دے گا، اس لیے کہ اگر عین خوشی کے وقت آخرت کا غم یاد آجائے، یہ یقین ہوجائے کہ روح عالم ارواح کی طرف جائے گی اور قیامت کے دن اپنے تمام اعمال کا بدلہ پانا ہے تو ساری خوشی کرکری ہوجاتی ہے، اس لیے کہا گیا ہے۔

مرا درمنزلِ جاناں چہ امن وعیش چوں ہر دم
جرس فریاد میدارد کہ بربندید محملہا

یہی مضمون اس شعر میں بھی ہے۔

عشرتِ امروز بے اندیشۂ فردا خوش است
فکرِ شنبہ تلخ دارد جمعۂ اطفال را

آگے حشر نشر، جزا وسزا، حساب کو ثابت کرنے اور اس کے گمان کی تردید کرنے کے لیے فرماتے ہیں:

بَلٰی ج

کیوں نہیں

ایسا نہیں، جیسا اس نے گمان کیا ہے بلکہ اس کی روح کا عالم ارواح کی طرف لوٹنا، پھر وہاں سے حشر ونشر کے عالم میں پہنچنا، پھر وہاں سے حساب کتاب اور وزنِ اعمال کے مقام تک پہنچنا، پھر وہاں سے جزا وسزا کے مقام تک جو جنت ودوزخ کی صورت میں ہے پہنچنا ضروری ہے، اور دلیل اس کی یہ ہے:

اِنَّ رَبَّهٗ كَانَ بِهٖ بَصِيْرًا ۝

اس کا رب اس کو دیکھتا تھا

اس کی پیدائش کی ابتداء سے لے کر موت کی انتہا تک اس کا سب کچھ پروردگار کی نظر میں ہے، روح اس کی کہاں سے آئی، کس کس چیز سے مل کر بنا، پھر عقائد واعمال کیسے رہے، دل میں کیا چیز جمی رہی، زبان سے کیا نکلا، ہاتھوں سے کیا سرزد ہوا، پھر موت کے بعد روح کہاں گئی اور جسم کہاں کہاں بکھرا ہے، ان سب باتوں سے جو واقف ہے وہ اس کو مہمل وبے کار نہیں چھوڑے گا، اس کی روح کو بدن کے اجزا کے ساتھ جمع کرے گا اور پھر اس کے کیے کا اس کو پورا بدلہ دے گا، لہٰذا یہ گمان کہ دوبارہ لوٹنا نہیں محض غلط ہے، اس کی تردید وابطال کے لیے قسم کھانے کی حاجت نہیں، تاہم اگر کسی کو ان عجیب حالات کے سننے سے کہ موت کے بعد دوبارہ زندگی ہوگی اور ایسے ایسے واقعات رونما ہوں گے کچھ شک ہو تو (بقسم کہتا ہوں کہ شک کی گنجائش نہیں ایسا ضرور ہوگا چنانچہ فرمایا)

(جاری ہے)

الازہار المربوعہ
(مسلسل)

محدث کبیر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی رحمۃ اللہ علیہ

اس کے بعد مجیب نے ایک لطیفہ لکھا ہے، اور اس لطیفہ کا مضمون انھوں نے اور جگہ بھی ذکر کیا ہے۔ (دیکھئے ص ۹۱)

بہر حال اس لطیفہ کا مضمون یہ ہے ''کہ اگر کوئی شخص اپنی بی بی کو طلاق بتہ دے اور ایک طلاق کی نیت کرے تو امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایک طلاق بائن ہوگی اور شوہر کو رجعت کا حق نہ ہوگا اور حدیث زیر بحث یعنی حدیث بتہ میں حضور فداہ ابی وامی نے رجعت کا حکم دیا، اب ناظرین انصاف فرمائیں کہ بایں ہمہ کاوش امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا اس حدیث کو قبول نہ فرمانا لطیفہ نہیں تو اور کیا ہے''؟ (آثار ص ۶۴)

جواب:- کچھ شبہہ نہیں کہ مجیب نے جو کچھ لکھا ہے وہ لطیفہ ہی ہے، اولاً تو میں مجیب سے پوچھتا ہوں کہ حدیث کے کس طریق میں یہ مذکور ہے کہ حضور نے رجعت کا حکم دیا۔

اگر مجیب کی نظر میں کوئی ایسا طریق ہو تو مع صفحہ کے کتاب کا حوالہ دیں اور عبارت نقل کریں، ورنہ اس غلط بیانی سے توبہ کریں۔

مجیب صاحب اگر اور سب غلط بیانیوں سے باز نہیں آتے تو نہ آئیں، لیکن خدا کے لیے کم از کم احادیث پر رحم فرمائیں، اور آنحضرت ﷺ کی طرف تو کوئی غلط بات منسوب کرنے سے احتراز کریں **مَنْ يَّقُلْ عَلَيَّ مَالَمْ أَقُلْه فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهٗ مِنَ النَّارِ** کی وعید شدید کو ہر وقت نگاہ میں رکھیں۔

میں ان کو بتانا چاہتا ہوں کہ حدیث بتہ ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ، مسند طیالسی، مسند شافعی، سنن دارمی، مستدرک حاکم، سنن دارقطنی، مشکوٰۃ، بلوغ المرام، منتقی، تخریج زیلعی، درایہ، تلخیص الحبیر، اغاثۃ اللہفان، زاد المعاد، العلل المتناہیہ قلمی، احکام عبدالحق قلمی، اطراف مزی قلمی، اور سنن کبری بیہقی

وغیرہ میں میں نے بچشم خود دیکھی اور پڑھی ہے، لیکن ان میں سے کسی کتاب میں یہ مضمون نہیں ہے کہ آں حضرت ﷺ نے رجعت کا حکم دیا۔

تنبیہ: اگر مجیب صاحب احتیاط سے کام لیتے اور یہ فرماتے کہ آنحضرت ﷺ نے حدیث بتہ میں جو جواب دیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ رجعت کرلوتو ہم اس کو مجیب کی غلط بیانی قرار نہ دیتے، بلکہ اس مطلب کے صحت وسقم پر بحث کرتے، مجیب ان دونوں باتوں میں اچھی طرح فرق کر کے جواب دینے کا ارادہ کریں۔

ثانیاً:- اگر بالفرض کسی طریق میں یہ وارد بھی ہوا ہو کہ آنحضرت ﷺ نے رجعت کا حکم دیا، یہ کہنا کہ ''امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ اس حدیث کو تسلیم نہیں فرماتے'' بالکل غلط ہے، اور اس غلطی کی بنا اس پر ہے کہ مجیب صاحب ہمارے علماء کی تحقیقات سے بے خبر ہونے کے ساتھ ساتھ علامہ ابن القیم کے ارشادات عالیہ سے بھی تہی دامن ہیں، وہ یہ جانتے ہیں کہ قرآن وحدیث میں رجعت کا لفظ صرف اپنی منکوحہ کو طلاق دے کر بلا نکاح جدید لوٹانے کے معنی میں وارد ہوا ہے، حالانکہ یہ خیال غلط ہے، علامہ ابن القیم نے زادالمعاد میں بڑی وضاحت سے لکھا ہے کہ اس معنی کے علاوہ اور دو معنوں میں بھی رجعت کا لفظ قرآن وحدیث میں مستعمل ہوا ہے، جن میں سے ایک نکاح جدید بھی ہے، فرماتے ہیں: **فالمراجعة وقعت فی كلام الله ورسوله على ثلاث معان: أحدها ابتداء النكاح لقوله تعالىٰ فان طلقها فلا تحل له من بعد حتى تنكح زوجاً غيره فان طلقها فلا جناح عليها أن يتراجعا إن ظنا أن يقيما حدودالله ولا خلاف بين أحد من أهل العلم بالقرآن أن المطلق هوالزوج الثانی وان التراجع بينها وبين الزوج الاول وذلک نكاح مبتدأ** (زادالمعاد برہامش زرقانی جلد ہفتم ص ۱۳۹) پس جب لفظ رجعت نکاح جدید کے معنی میں بھی مستعمل ہوتا ہے تو جب تک مجیب صاحب یہ ثابت نہ کریں کہ حدیث بتہ میں آیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے رجعت کا حکم دیا اور اس حدیث میں رجعت سے نکاح جدید مراد لینا ناممکن ہے اس وقت ان کا یہ قول کہ امام صاحب اس حدیث کو تسلیم نہیں فرماتے، بالکل غلط ہے، اس لیے کہ ہم کہیں گے کہ اگر بالفرض اس حدیث میں یہ وارد ہوا ہو کہ آں حضرت ﷺ نے رجعت کا حکم دیا تو چونکہ علامہ ابن القیم نے رجعت کا ایک معنی نکاح جدید بھی بیان کیا ہے، اس لیے ہوسکتا ہے کہ یہاں

نکاح جدید مراد ہو، پس حدیث سے یہ ثابت ہوگا کہ لفظ بتہ سے جو آدمی طلاق دے وہ اگر ایک کی نیت کرے تو نکاح جدید کر کے اس عورت کو لوٹا سکتا ہے اور یہی امام صاحب بھی کہتے ہیں، ہمارا پورا بیان پڑھنے کے بعد ہر شخص معلوم کر سکتا ہے کہ ہمارے دوست مجیب نے حدیث بتہ سے گلوخلاصی کے لیے کتنا کتنا پیچ وتاب کھایا، لیکن ان کی توقع کے خلاف گرفت اور زیادہ سخت ہوتی گئی اور ان کی مضطربانہ حرکت ان کے لیے بلائے جان ثابت ہوئی۔

باب سوم

میں نے اعلام مرفوعہ کا تیسرا باب یوں شروع کیا تھا: ''چونکہ مخالفین کے پاس دلائل نہیں ہیں اور وہ خود اپنے مسلک کی کمزوری محسوس کرتے ہیں اس لیے اس پر پردہ ڈالنے کے لیے غلط بیانیوں سے کام لیتے ہیں، میں چاہتا ہوں کہ ان غلط بیانیوں کو بھی ظاہر کر دوں تاکہ ناواقف حضرات فریب میں نہ آئیں''۔

اس عبارت کا کچھ حصہ نقل کر کے مجیب صاحب نے خوب جلی کٹی سنائی ہے، جس کا جواب دینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، ہر موافق ومخالف آثار متبوعہ اور یہ رسالہ پڑھ کر فیصلہ کر سکتا ہے کہ مجیب نے جو باتیں لکھی ہیں وہ مجھ پر صادق آتی ہیں یا خود ان پر۔

اس کے بعد میں نے اعلام میں لکھا تھا: ''پہلی غلط بیانی یہ ہے کہ اپنے مسلک کی قوت ظاہر کرنے کے لیے کہہ دیا جاتا ہے کہ حضرت علی وابن مسعود وعبدالرحمٰن بن عوف وابوموسی اشعری وزبیر وجابر اور دیگر بڑے بڑے صحابۂ کرام یہی فرماتے ہیں (یعنی ایک مجلس کی تین طلاقوں کو ایک کہتے ہیں) مجھے نہایت افسوس ہے کہ ایسی صریح غلط بیانی کی جرأت لوگوں کو کیونکر ہوئی جب کہ مخالفین کے امام معصوم علامہ ابن القیم نے اغاثۃ اللہفان میں نہایت صفائی کے ساتھ یہ لکھا ہے کہ حضرت ابن عباس کے سوا اور کسی صحابی سے اس قول کی نقل صحیح ہم کو معلوم نہیں ہوئی، اسی وجہ [سے] ہم نے اس کو اختلاف کی وجہوں میں شمار نہیں کیا (اغاثہ ص ۱۷۹)

میری اس عبارت کو بھی نقل کر کے مجیب صاحب نے پہلے دشنام طرازی کی مشق کی ہے اور ''امام معصوم'' کے لفظ پر انتہائی برہمی کا اظہار فرماتے ہوئے لکھا ہے کہ ''بطور تقیہ اہل حدیثوں کو شیعہ کہا جاتا ہے''۔ حالانکہ اگر مجیب صاحب عقل وخرد سے کام لیتے تو برہمی کی کوئی وجہ نہ تھی، اس لیے کہ مجیب

صاحب ائمہ اربعہ کے اقوال کو بے جانچ پڑتال کے نہیں مانتے اور کہتے ہیں کہ یہ حضرات معصوم نہیں ہیں، ممکن ہے کہ ان سے خطا ہوگئی ہو، لہذا بغیر جانچے ہوئے ان اقوال کو نہیں مانا جاسکتا، لیکن علامہ ابن القیم کے اقوال کی جانچ پڑتال کی کوئی ضرورت نہیں سمجھتے، انھوں نے جو کچھ لکھ دیا اس کو پتھر کی لکیر سمجھتے ہیں، پس بتایا جائے کہ اگر ان کو معصوم نہیں سمجھا جاتا تو جانچ پڑتال کی ضرورت کیوں نہیں سمجھی جاتی؟ ابن الجوزی کا جو قول ابن القیم نے حدیث بتہ کی نسبت نقل کیا ہے کم سے کم اسی کو مثال کے طور پر سامنے رکھ لیجئے اور انصاف سے جواب دیجئے۔ اس کے بعد یہ بھی ملاحظہ ہو کہ ''امام معصوم'' کا لفظ لکھ دینا تو اہلحدیثوں کو شیعہ لکھنا ہے، لیکن ''تقیہ'' کا لفظ لکھنا ہم کو شیعہ قرار دینا نہیں ہے؟ کیا یہ خباثت نہیں ہے؟ کیا شیعوں کے علاوہ اور کوئی بھی تقیہ کو مانتا ہے؟ پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ امام معصوم کے لفظ سے تو مجیب صاحب اتنے چراغ پا ہوگئے، لیکن اس پر غور نہیں کیا کہ ان کے بڑے بڑوں نے مقلدین کو پوری صراحت کے ساتھ کیا کیا کہا ہے، اس وقت صرف ایک عبارت ملاحظہ ہو، نواب صدیق حسن خاں صاحب لکھتے ہیں: ''مقلدین پر اطلاق لفظ مشرکین کا، تقلید پر اطلاق لفظ شرک کا کیا جاتا ہے۔ دنیا میں اکثر لوگ یہی مقلد پیشہ ہیں وما یؤمن أکثرهم بالله الا وهم مشرکون یہ آیت ان پر بخوبی صادق ہے (اقتراب الساعہ ص ۱۶) مجیب فرمائیں کہ یہ بھی خباثت ہے یا نہیں؟

اس دشنام طرازی کے بعد مجیب نے جو سخن سازی و چیلنج بازی کی ہے اس کا جواب اس کتاب کے مقدمہ میں ملاحظہ کیجئے۔ ہاں مجیب نے یہ جو لکھا ہے کہ ''حافظ ابن قیم کو اگر حضرت علی وابن مسعود اور دیگر حضرات صحابہ کے متعلق نقل صحیح نہیں معلوم ہوئی تو کوئی خوش ہونے کی بات نہیں، اس مسئلہ میں آپ کے ناخدا حافظ ابن حجر کو تو معلوم ہے'' الخ (مختصراً) تو اس کی نسبت گذارش ہے کہ اولاً تو یہ بالکل جھوٹ ہے کہ حافظ ابن حجر کو اس کے متعلق نقل صحیح معلوم ہے، کہیں ابن حجر نے اس کا دعویٰ نہیں کیا نہ آپ نے ان کی کسی عبارت سے اس کو ثابت کیا۔

ثانیاً: - ابن حجر کی جو عبارت آپ نے ص ۷ و ص ۸ میں نقل کی ہے، بآنگ دہل پکار رہی ہے کہ ابن حجر نے اس کو ابن مغیث صاحبِ وثائق کے حوالہ سے ذکر کیا ہے اور ابن مغیث کی وثائق حافظ ابن القیم کے پیش نظر بھی تھی، جیسا کہ اغاثہ اور تعلیق مغنی ص ۴۴۵ سے ظاہر ہے، بایں ہمہ ابن القیم فرماتے ہیں کہ ''ابن عباس کے سوا اور کسی صحابی سے اس قول کی نقل صحیح ہم کو معلوم نہیں ہوئی'' پس معلوم

ہوا کہ وثائق کی نقل جو ان کے پیش نظر تھی ان کے نزدیک صحیح نہیں ہے، حاصل یہ کہ جو نقل ابن حجر کو معلوم ہے وہ ابن القیم کو بھی معلوم تھی، باوجود اس کے انھوں نے نقل صحیح کے معلوم ہونے کی نفی کی ہے، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ جو نقل معلوم تھی وہ صحیح نہ تھی، اور یہی وجہ ہے کہ حافظ نے اس نقل کی صحت کا دعویٰ نہیں کیا۔

باقی رہا یہ فرمانا کہ ''اسی عبارت سے جس سے ابن قیم اپنی عدم واقفیت ظاہر کرتے ہیں، حافظ ابن حجر ابن التین کا جواب دیتے ہیں اور معارضہ کرتے ہیں'' (آثار ص ۱۲۲)۔

تو یہ بھی غلط بیانی یا نافہمی ہے، اس لیے کہ حافظ نے ابن التین کا جواب دینے سے پہلے صرف وہی عبارت نہیں نقل کی ہے، بلکہ اس کے علاوہ غنوی اور ابن المنذر کے حوالہ سے بعض مشائخ قرطبہ اور بعض اصحاب ابن عباس کا مسلک بھی نقل کیا ہے، اور ابن التین کا جواب دینے کے لیے انھیں دونوں میں سے کسی ایک کا صحیح ہونا بھی کافی ہے، فتدبر وتشکر، ہاں یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ حافظ ابن القیم اس عبارت سے اپنی عدم واقفیت ظاہر نہیں کرتے، بلکہ نقل صحیح سے (وبینهما بون بعید) اس لیے کہ بتایا جا چکا ہے کہ ابن حجر نے جس کتاب کا حوالہ دیا ہے وہ ابن القیم کے بھی پیش نظر تھی، لہذا یہ بیان بھی غلط بیانی سے خالی نہیں۔

یہاں پر مجیب نے حاشیہ میں یہ بھی لکھا ہے کہ ''وستانی اور قمی نے ان حضرات صحابہ کا یہی مذہب تحریر فرمایا ہے''۔ میں کہتا ہوں کہ اگر مجیب کی مراد وہی چار صحابی ہیں جن کو ابن مغیث کے حوالہ سے ابن حجر نے لکھا ہے تو وستانی کا حوالہ صحیح ہے، لیکن چونکہ وستانی نے ابن عات اور ابن عات نے انھیں ابن مغیث کے حوالہ سے اس کو ذکر کیا ہے لہذا یہ حوالہ کچھ مفید نہیں ہے، اس لیے کہ ابن القیم کے نزدیک یہ نقل صحیح نہیں ہے، اور اگر مجیب کی مراد وہ صحابہ ہیں جن کو بنارسی مفتی نے لکھا ہے تو یہ حوالہ غلط ہے، اس لیے کہ وستانی نے حضرت ابوموسی کا نام نہیں لکھا ہے۔ اب رہا قمی کا حوالہ تو یہ بہر حال غلط ہے اس لیے کہ قمی نے کوئی تصریح نہیں کی ہے کہ کس کس صحابی کا یہ مذہب تھا۔ مجیب سچے ہوں تو قمی کی عبارت نقل کریں۔

میں نے اعلام میں لکھا تھا:

''ناچیز کہتا ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے بھی اس قول کی نقل صحیح نہیں ہے جیسا کہ عنقریب معلوم

ہو جائے گا، لہٰذا ان کا استثنا بھی علامہ کا تخیل ہی تخیل ہے، بہر حال یہاں یہ بحث نہیں ہے مجھ کو یہاں یہ دکھانا ہے کہ مخالفین جس کے بل بوتے پر اکڑتے پھرتے ہیں وہ خود ہی لکھ رہا ہے کہ نہ علی رضی اللہ عنہ سے اس کی نقل صحیح معلوم ہوسکی، نہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے اور نہ ابن عوف رضی اللہ عنہ سے، نہ ابوموسی رضی اللہ عنہ سے اور نہ زبیر رضی اللہ عنہ سے، نہ جابر رضی اللہ عنہ سے نہ کسی دوسرے صحابی سے''۔

مجیب صاحب اس عبارت کا کچھ حصہ نقل کرکے پہلے تخیل کے لفظ پر بگڑے بنے ہیں، اس کے بعد یہ لکھا ہے کہ ''اہل حدیثوں کو اولاً کلام الٰہی کا بل بوتہ ہے، اور اس کے بعد احادیث رسالت پناہی صلی اللہ علیہ وسلم کا'' پھر مقلدین پر ''اقوال الرجال کے اثبات کے لیے صحیح احادیث نبویہ کا قتل عام کرنے'' کی تعریض ہے، لیکن یہ ساری باتیں بے جا ہیں، مجیب صاحب ہر مسئلہ میں عموماً ابن حزم یا ابن تیمیہ یا ابن القیم یا کسی شافعی کی تقلید جامد کرتے ہیں اور ان کی تحریروں کو اپنے حق بجانب ہونے کی بڑی سے بڑی دستاویز سمجھتے ہیں، اور اگر یہ کچھ نہ ہو پر تو بھی اپنے فہم سراپا وہم کی حمایتِ بیجا میں صحیح وحسن حدیثوں کو موضوع کہہ دیتے ہیں، بالخصوص اس مسئلہ میں تو ابن تیمیہ وابن القیم رحمہما اللہ نے جو لکیر کھینچ دی ہے اس سے ایک انچ بھی ہٹنا نہیں چاہتے، آپ مجیب کے جوابات علامہ ابن القیم کی تصنیفات سامنے رکھ کر پڑھئے، آپ کو صاف نظر آئے گا کہ ع

آنچہ استاد ازل گفت ہماں می گوید

باقی یہ مجیب کی جرأت ہے کہ انھیں کے قدم بقدم چلتے بھی ہیں اور پیروی سے انکار بھی کرتے جاتے ہیں۔

میں نے اعلام میں لکھا تھا:

''مخالفین نے صرف ان ناموں پر بس نہیں کیا، بلکہ اس کے ساتھ دیگر بڑے بڑے صحابہ کی طرف بھی نسبت کردی'' اس عبارت کے جواب میں مجیب نے جو کچھ لکھا ہے اس کا جواب اس کتاب کے ص...... میں ملاحظہ کیجئے۔ باقی ابن القیم کی تقلید میں جو انھوں نے یہ لکھا ہے کہ ''عہد نبوی اور عہد صدیقی میں تمام صحابہ اسی کے قائل تھے، اگر کچھ دم خم ہے تو عہد نبوی اور عہد صدیقی کا ایک واقعۂ صحیح اس کے خلاف پیش کیجئے'' (آثار ص ۱۲۴)

تو گذارش ہے کہ اگر آپ واقعی احادیث کے بل بوتے پر لکھا کرتے ہیں تو کسی ایک صحیح

حدیث سے خط کشیدہ عبارت کا مضمون ثابت کر کے سرخروئی حاصل کیجیے، ورنہ ابن القیم کی تقلید جامد کا اعتراف کیجیے۔اس میں بھی کچھ مضائقہ نہیں کہ بنارس وغیرہ سے بھی مدد لے لیجیے۔

ہاں یہ خیال رہے کہ کہیں گھبراہٹ میں حدیث مسلم کا نام نہ لے لیجیے گا، اس لیے کہ اس سے آپ کا مدعا کسی طرح حاصل نہ ہوگا، آپ کو یاد ہوگا کہ آپ نے آثار ص ۳۳ میں علامہ امیر یمانی کی ایک عبارت نقل کی ہے جس کے آخری فقرہ کا ترجمہ ص ۳۴ میں آپ نے یہ کیا ہے کہ ''خاموش رہنے والے کی طرف اتفاق یا اختلاف کسی کو منسوب نہیں کیا جاسکتا جب تک کہ اس کی زبان اس کو نہ بتادے'' انتہیٰ، لہٰذا جب تک ہر صحابی کی زبان اس کو نہ بتائے گی اس وقت اس کا قائل ہونا ثابت نہ ہوسکے گا۔ علاوہ بریں ابن القیم نے ان دونوں عہدوں کے صحابہ کو اسی طرح قائل قرار دیا ہے کہ ان کے تخیل میں کوئی مفتی تھا کوئی ساکت تھا، اور آپ کے نزدیک سکوت سے قائل ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ ورنہ اجماع کی بحث میں آپ ہرگز یہ نہ لکھتے، کہ ''پہلے اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں سے ان تمام صحابہ کا قول نقل فرمائیں جوارباب حل وعقد تھے'' (ص ۱۱۶) پھر یہ بھی خوب سوچ لیجیے کہ اگر مسلم کی اس حدیث سے یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کیجیے گا تو مسلم ہی کی دوسری حدیث سے جو متعہ کے باب میں ہے کیا ثابت ہوگا، یہاں تو قول ہی تک بس ہے، لیکن وہاں تمام صحابہ کا فعل ثابت ہوگا۔ (والعیاذ باللہ) مجھے آپ سے تو اصلاً تعجب نہیں ہے، لیکن علامہ ابن القیم سے سخت تعجب ہے کہ ان کو اپنے استاد کی حمایت کی دھن میں اس کا خیال بھی نہ رہا۔

میں نے اعلام میں لکھا تھا:

''اور جب غلط بیانی ہی پر اتر آئے تھے تو اسی پر بس کیوں کرتے، انھوں نے اس کے لیے فتح الباری کا حوالہ بھی دے ڈالا اور اس کا کچھ خیال نہ کیا کہ ان کو خدا کے پاس جانا ہے، اور ہر بات کا جواب دینا ہے، آخر اس غلط بیانی کا کیا جواب ہوگا؟ خیر اس کو وہ جانیں کہ خدا کو کیا جواب دیں گے لیکن مجھ کو یہ بتائیں کہ میرے ان سوالات کا ان کے پاس کیا جواب ہے۔

۱:- کیا آپ بحلف شرعی کہہ سکتے ہیں کہ ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کا یہی مذہب فتح الباری میں لکھا ہے؟

۲:- کیا آپ بحلف شرعی کہہ سکتے ہیں کہ جابر رضی اللہ عنہ کا یہی مذہب فتح الباری میں بتایا ہے''

(باقی تین سوال آگے آتے ہیں)

صاحب آثار نے صرف میرے پانچوں سوالوں کی عبارت یکجا نقل کی ہے، اور اس کے بعد ایک تمہید لکھی ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ بنارسی مفتی نے مذکورہ بالا صحابہ کا نام تین کتابوں سے منتخب کیا ہے اور ان تینوں کتابوں کا حوالہ اپنے فتویٰ میں دے دیا ہے، وہ تینوں کتابیں یہ ہیں (۱) تعلیق المغنی (۲) فتح الباری (۳) نیل الاوطار۔

اس تمہید سے مجیب کی غرض یہ ہے کہ صرف فتح الباری میں ابوموسی اشعری رضی اللہ عنہ کا نام ہونے سے بنارسی مفتی کی غلط بیانی ثابت نہیں، ہاں اگر تینوں میں سے کسی کتاب میں یہ نام نہ ملے تو بیشک غلط بیانی ہوگی، مگر ایسا نہیں ہے، بلکہ نیل الاوطار میں ابوموسی رضی اللہ عنہ کا نام موجود ہے، باقی رہے حضرت جابر تو ان کا نام فتویٰ میں لکھا ہی نہیں گیا۔ میرے دو پہلے سوالوں کے جواب میں مجیب نے جو کچھ لکھا ہے اس کا حاصل یہی ہے۔

اس پر میری گزارش یہ ہے کہ مشتے کہ بعد از جنگ یاد آید برکلۂ خود باید زد۔ اعلام کی اشاعت کے بعد جب بنارسی مفتی کی غلط کاری کا راز طشت از بام ہو چکا تو اب کسی ترمیم واصلاح سے اس پر پردہ ڈالنے کی کوشش بے سود ہے۔ میں نے مانا کہ اب آپ نے فتح الباری کے ساتھ تعلیق ونیل کے نام کا اضافہ بھی فتوی میں کر دیا ہے، اور حضرت جابر کا نام بھی یہاں حذف کر دیا ہے اور بجائے اس کے تابعین کے سلسلہ میں جابر بن زید کا نام بڑھایا ہے، لیکن یہ ساری شرمناک کارروائیاں بعداز وقت ہیں اور اس بدنما دھبے کو مٹانے میں کچھ کارگر نہیں ہیں جو بنارسی مفتی کے دامن میں لگ چکا ہے۔ ہاں اگر اس دھبے کو مٹانا ہے تو میرے ان سوالات کے حلفیہ جوابات شائع کیجئے جو اس کتاب کے ص ۷ پر درج ہیں۔

یہ تو دو سوالوں کے جوابات کی حقیقت تھی۔ اب تین باقی سوال اور ان کے جوابات سنئے۔

(سوال نمبر۳) کیا آپ کسی ضعیف سے ضعیف اسناد سے حضرات مذکورہ بالا کا قول یا فتویٰ پیش کر سکتے ہیں (اعلام)

(جواب نمبر۳) مفتی بنارس نے جن حوالوں سے اس کو لکھا ہے ان کی تصحیح نقل ان کا فرض ہے اور یہ انھوں نے کر دیا ہے (آثار)

(اس جواب کی حقیقت) ناظرین! کیا اس جواب کا صاف صاف یہ مطلب نہیں ہے کہ بنارسی مفتی اور ان کے وکیل جناب مجیب کسی ضعیف سے ضعیف اسناد سے بھی حضرات مذکورہ بالا کا قول یا فتویٰ پیش نہیں کر سکتے۔اور کیا یہ اپنے عجز و درماندگی کا کھلا ہوا اعتراف نہیں ہے؟ اور کیا یہ اس بات کا اعلان نہیں ہے؟ کہ یہ لوگ جو بات بھی کہیں پا جاتے ہیں اس کو بے تحقیق لکھ جاتے ہیں۔

(سوال نمبر۴) کیا آپ کسی نامعتبر سے نامعتبر کتاب میں یہ لکھا ہوا دکھا سکتے ہیں کہ حضرت ابوموسیٰ اشعری اور حضرت جابر صحابی کا یہی مذہب تھا (اعلام)

(جواب نمبر۴) نامعتبر سے نامعتبر کتاب کی کیا ضرورت ہے؟ معتبر سے معتبر کتاب نیل الاوطار میں موجود ہے کہ ابوموسی اشعری کا یہی مذہب تھا، باقی جابر صحابی کا مذہب تو یہ آپ کی خانہ ساز بات ہے (آثار)

(اس جواب) میں حضرت جابر کی نسبت جو بات لکھی ہے اس کی حقیقت تو منکشف ہو چکی ہے، باقی جو بات حضرت ابوموسی کی نسبت لکھی ہے اس میں سخت ابلہ فریبی سے کام لیا ہے، مجیب کے الفاظ سے عوام تو یہی سمجھیں گے کہ نیل الاوطار میں اس کے مصنف علامہ شوکانی نے بذات خود حضرت ابوموسی کا یہی مذہب بتایا ہے، حالانکہ یہ بالکل غلط ہے، شوکانی نے اپنی تحقیق سے اس کو نہیں لکھا ہے، بلکہ یہ لکھا ہے **حکی ذٰلک صاحب البحر عن أبی موسی** (اس کو صاحب بحر نے ابوموسی سے حکایت کیا ہے) ملاحظہ کیجئے، شوکانی اپنی تحقیق سے اس کو نہیں لکھتے، بلکہ صاحب بحر کا حوالہ دیتے ہیں، اور مجیب کا اصول یہ ہے کہ کوئی مصنف اپنی کتاب میں کوئی بات لکھے تو کچھ ضرور نہیں کہ وہ اس کا قائل بھی ہو، پس نیل الاوطار میں یہ موجود ہی ہو اور نیل الاوطار معتبر ہی ہو تو مجیب کو کیا فائدہ؟ اگر کہئے کہ اچھا صاحب بحر نے جو لکھا ہے اس کا کیا جواب ہے؟ تو گذارش ہے کہ صاحب بحر زیدی شیعہ ہیں، ان کا لکھنا اور نہ لکھنا دونوں برابر ہے، یہاں گفتگو اہل سنت سے ہے، اہل سنت کی کسی معتبر یا نامعتبر کتاب میں دکھا سکتے ہوں تو دکھایئے، نامعتبر کتاب سے کسی رافضی یا خارجی یا زیدی کی کوئی کتاب مراد نہیں ہے، ورنہ یوں تو آپ روافض کی کتابوں سے خدا جانے کیا کیا دکھا سکتے ہیں۔

(سوال نمبر۵) کیا آپ بحلف شرعی کہہ سکتے ہیں کہ حافظ ابن حجر یا کسی محدث نے کسی حدیث و آثار کی کتاب کے حوالہ سے ان حضرات کا یہ فتویٰ نقل کیا ہے، اگر جواب اثبات میں ہے تو اس محدث کا نام لکھئے اور اس کا محدث ہونا ثابت کیجئے، پھر حدیث و آثار کی اس کتاب کا نام لیجئے جس سے یہ فتویٰ نقل کیا گیا ہے، آخر یہ کہاں کا انصاف ہے کہ ہم سے ہر ہر بات کی سند مانگی جاتی

ہے اور جب اپنی باری آتی ہے تو سند پیش کرنے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی (اعلام)

(جواب نمبر ۵) مفتی بنارس نے جن کتابوں کا حوالہ دیا ہے ان کا وہ ذمہ دار ہے اور ان کتابوں کے نام بھی بتادیے ہیں، حافظ ابن حجر وغیرہ نے جن کتابوں سے ان حضرات کے فتاوے نقل کیے ہیں، ان کے نام بھی لکھ دیے ہیں، آپ نے تو ماشاءاللہ بہت کچھ داد تحقیقات دی ہے، اس کی بھی تحقیق کر لیجئے گھبرانے کی کون سی بات ہے۔ (آثار)

میں کہتا ہوں سوال از آسمان و جواب از ریسماں، اسی کو کہتے ہیں، میں کیا پوچھ رہا ہوں اور مجیب کیا کہہ رہے ہیں۔ کیا اس سے ہر عامی و جاہل یہ نتیجہ نکالنے پر مجبور نہ ہوگا کہ ہرگز ہرگز کسی محدث نے حدیث وآثار کی کسی کتاب سے حضرات مذکورہ بالا کا فتویٰ نقل نہیں کیا ہے، اور بنارسی مفتی نے صرف علامہ شوکانی وغیرہ کی تقلید میں بلاتحقیق ان حضرات کے نام لکھ دیے ہیں، اور یہیں سے سمجھا جا سکتا ہے کہ جو لوگ دوسروں کو تقلید کا طعنہ دیا کرتے ہیں وہ خود دام تقلید میں کیسے سخت گرفتار ہیں۔

اسی ضمن میں جناب مجیب یہ صریح غلط بیانی بھی کر گئے کہ ''ابن حجر وغیرہ نے جن کتابوں سے ان حضرات کے فتاوے نقل کیے ہیں ان کے نام بھی لکھ دیے ہیں'' ابن حجر وغیرہ نے ان حضرات کے فتاوے ہرگز نقل نہیں کیے ہیں، مجیب صاحب سچے ہوں تو ابن حجر وغیرہ کی کتابوں سے ان فتاویٰ کی عبارتیں نقل کریں۔

باقی رہی مجھ سے تحقیق کی فرمائش تو میں تحقیق کر چکا ہوں، اور اسی تحقیق کی بنا پر علیٰ رؤس الاشہاد کہتا ہوں کہ اس سلسلہ میں حضرات مذکورہ بالا کا نام لینا بالکل بے تحقیق بات ہے۔

اب ایک بات رہی جاتی ہے وہ یہ کہ مجیب نے میرے سوالات کا جواب دینے سے پہلے لکھا ہے: مؤلف نے چونکہ ان سوالات کو بہت اہمیت دی ہے اور ان سوالوں پر مولف کو بڑا ناز ہے، کیونکہ اخبار العدل میں یہ اشتہار دیا گیا ہے کہ اعلام مرفوعہ کے صفحہ ۲۱ میں جو پانچ قاہر سوالات درج ہیں ان کا حلفی جواب حاصل کر کے ضرور شائع کریں، اور ایسے انداز سے جواب لکھیں کہ نفس مسئلہ کے صاف ہونے کی توقع کی جائے۔ ''راقم ایک علم دوست'' اس لیے میں بھی ناظرین سے درخواست کرتا ہوں کہ ان پر پوری پوری توجہ کریں (آثار ص ۱۲۵)

مجھے ان سوالات پر ناز ہو یا نہ ہو، لیکن اس میں کچھ شبہہ نہیں کہ میرے ان سوالات نے

بنارسی مفتی اور ان کے وکیل کو حواس باختہ کردیا، جیسا کہ مجیب کے جوابات سے ظاہر ہے، ناظرین ملاحظہ فرمائیں کہ اولاً تو مجیب نے میرے ہر سوال کے جواب میں غیر متعلق اور بے تکی بات لکھی ہے۔

ثانیاً:- جو الٹے سیدھے جوابات دیے ہیں ان کو بھی حلف شرعی کے ساتھ نہیں لکھا ہے، اس سے ناظرین خود سمجھ سکتے ہیں کہ اگر ان کے جوابات غیر متعلق اور ترمیم واصلاح پر مبنی نہ تھے تو حلف شرعی سے بچنے کی کیا وجہ تھی؟

ثالثاً:- جب آپ نے کسی ''علم دوست'' کی اس تحریر کا بھی لحاظ کیا تھا جو العدل میں شائع ہوئی تھی، تو آپ کا فرض تھا کہ بنارسی مفتی سے حلفی جوابات حاصل کرکے شائع کرتے، لیکن آپ نے یہ بھی نہیں کیا، آخر اس کی کیا وجہ؟ ع

کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

رابعاً:- پانچویں سوال کی پوری عبارت بھی نقل نہیں کی، خط کشیدہ حصہ بالکل ہضم کر گئے، اس کی وجہ بالکل کھلی ہوئی ہے کہ کسی محدث نے حضرات مذکورہ بالا کا فتویٰ حدیث وآثار کی کسی کتاب سے نقل ہی نہیں کیا، بلکہ ان فتووں کا کہیں وجود ہی نہیں ہے، پھر ان کی سند کہاں ہوگی، اس لیے مجیب سوال کے اس حصہ کو نقل کرکے اپنے کو رسوا کیوں کرتے۔

(جاری ہے)

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

صفحہ ۲۷ کا بقیہ

ان مدارس پر کتابیں وقف کرنا شرع کیں، نیز ان کے واسطے بڑے بڑے اوقاف مخصوص کیے جو ان کے دوام واستمرار اور طویل مدت تک اسلام اور مسلمانوں کی اس طرح خدمت کے قابل بنادیا کہ ان کے انتظام اور بندوبست کے لیے دوسرے ذرائع تلاش نہیں کرنے پڑے۔

اسی کے ساتھ یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہئے کہ مدارس میں ہونے والی تعلیم نے مساجد کی تعلیم پر ضرب نہیں لگائی، بلکہ رب کائنات کا شکر ہے کہ دونوں مقامات کی تعلیم اس وقت سے آج تک دوش بدوش چلی آرہی ہے۔

(جاری ہے)

حقیقۃ الفقہ کی ایک فصل

''احادیث مندرجۂ کتبِ فقہ اعتبار کے قابل نہیں''

[یہ حضرت محدث الاعظمی ؒ کا عہد شباب کا لکھا ہوا مضمون ہے، جو تقریباً ۱۶ر سال پہلے مقالات ابوالمآثر جلد اول میں بھی شائع کیا جاچکا تھا، اس میں جس اعتراض کا جواب دیا گیا ہے اس طرح کے اعتراضات سے چونکہ اکثر لوگوں کو سابقہ پڑتا رہتا ہے، اس لیے اس اہم مضمون کو اس وقت المآثر کے صفحات پر شائع کیا جارہا ہے (ادارہ)]

یہ ''حقیقۃ الفقہ'' مصنفہ مولوی یوسف جے پوری کی ایک فصل کا عنوان ہے، اس فصل میں اس نے چند عبارتیں اس مضمون کی نقل کی ہیں: ''فتاوے کی بہت سی کتابوں میں موضوع حدیثیں مذکور ہیں لہٰذا جب تک ان کی سند نہ ظاہر ہو یا علماءِ محدثین کا اس پر اعتماد نہ ظاہر ہو اس وقت تک ان پر پورا بھروسہ نہ کرنا چاہئے''۔

عبارات مذکورہ اپنے مفہوم کے لحاظ سے کسی تشریح کی محتاج نہیں ہیں۔ گفتگو صرف اتنی ہے کہ مصنف حقیقۃ الفقہ کا اس سے کیا منشا ہے؟ ہمارے خیال میں اس کا دو ہی مقصد ہوسکتا ہے:

ایک تو یہ کہ جب احادیث مندرجۂ فقہ قابلِ اعتبار نہیں تو مسائل فقہ بھی درخورِ قبول نہیں ہیں۔ دوسرے: مصنفینِ کتبِ فقہ کی عیب گیری ونکتہ چینی۔

اگر پہلی بات ہے، تو ہم عرض کریں گے کہ احادیث مندرجۂ فقہ کے ناقابل اعتبار ہونے سے یہ نتیجہ نکالنا محض غلط ہے، کسی کتاب میں کوئی ایک بات غلط لکھ گئی ہو تو اس کی ساری باتوں کا غلط ہونا لازم نہیں آتا، احیاء العلوم مصنفہ امام غزالی شافعی کی خوبیوں کا دنیا اعتراف کررہی ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی بہت سی حدیثیں جو اس میں درج ہیں قابلِ اعتبار نہیں ہیں۔ علامہ عراقی شافعی کی تخریج پڑھئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ احیاء میں کس کثرت سے موضوع حدیثیں درج ہیں۔ باجود اس کے کتاب کے دوسرے مضامین علماء کی نظر میں بے حد پسندیدہ اور حق وصواب ہیں۔ آپ نے دیکھا کہ

احادیث کے بے اعتبار ہونے کی وجہ سے بقیہ مضامین درجۂ اعتبار سے ساقط نہیں ہوگئے۔

اسی طرح تفسیر کبیر امام رازی میں بعض حدیثیں نا قابل اعتبار ہیں اوران کے موضوع ہونے کی علماء نے تصریح کی ہے، لیکن اس کی وجہ سے کتاب کے بقیہ مضامین بے اعتبار نہیں ہوگئے، چنانچہ اب علماء حدیث اس کے مضامین سے استناد کرتے ہیں (دیکھو رسالہ قراءت خلف الامام مصنفہ مولوی ابراہیم سیالکوٹی، وتحقیق الکلام مصنفہ مولوی عبدالرحمٰن صاحب مبارک پوری وغیرہ)

اسی طرح سنن ابن ماجہ میں حسب تصریح علماء محدثین چند موضوع حدیثیں درج ہیں، تو کیا ان چند حدیثوں کے نا قابل اعتبار ہونے کی وجہ سے باقی احادیث بھی نا قابل اعتبار ہوجائیں گی؟ الغرض اس قسم کی صدہا مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔

بات اصل یہ ہے کہ جس فن میں جو کتاب ہو اس کو اسی فن کے لحاظ سے دیکھنا چاہئے، احیاء العلوم کا جو موضوع ہے اس کے ہی لحاظ سے دیکھنا چاہئے کہ اس میں کیا کیا خوبیاں ہیں۔ اگر موضوع فن کے لحاظ سے اس میں کوئی نقص نہیں ہے تو کافی ہے۔ اب اگر دوسرے لحاظ سے بھی اس میں کوئی نقص نہ ہو تو نور علی نور! اور اگر دوسرے لحاظ سے کوئی تقصیر یا نقص پایا جاتا ہو تو بھی فنی حیثیت سے کتاب پر کوئی حرف نہیں آسکتا۔ اسی طرح فقہ کی بعض کتابوں میں اگر کوئی یا چند حدیثیں نا قابل اعتبار درج ہوگئیں تو اس کے مسائل پر کیا اثر پڑا، زیادہ سے زیادہ یہ کہ اس مصنف نے مسئلہ کی جو دلیل بیان کی وہ غلط ہوگئی، ہم سے آپ دوسری صحیح دلیل لیجئے۔ ایک دلیل کے غلط ہوجانے سے مسئلہ غلط نہیں ہوسکتا، اس لیے کہ ایک ایک مسئلہ کے متعدد دلائل ہوا کرتے ہیں۔ وجود باری ہمارا اور آپ کا ایک مسلمہ مسئلہ ہے، فرض کیجئے ایک شخص اس کی ایک دلیل بیان کرے اور وہ غلط ثابت ہو، تو کیا وجود باری کا مسئلہ غلط ہوگیا، میں سمجھتا ہوں کہ ہر عقلمند یہی کہے گا کہ ایک شخص کی بیان کی ہوئی ایک دلیل کے غلط ہوجانے سے مسئلہ غلط نہیں ہوسکتا، تاوقتیکہ تمام دلائل غلط و بے بنیاد نہ ہوجائیں۔

اور اگر مصنف کا منشا اس سے مصنفین کتب فقہ کی عیب گیری ہے تو میں عرض کروں گا کہ یہ پہلی صورت سے بھی زیادہ بیہودہ صورت ہے، اولاً تو بھول چوک اور سہو ونسیان کس انسان سے نہیں ہوتا **نسی آدم فنیست ذریته** (بخاری)۔ ثانیاً اہل علم خوب جانتے ہیں کہ بڑے بڑے ماہرین فن سے خود اس فن میں بھول چوک ہوجاتی ہے جس کے وہ ماہر ہوتے ہیں، پس اگر کوئی ایسا عالم جس کا

ایک فن خاص ہے کسی دوسرے فن میں سہو کر جائے تو کیا تعجب ہے، بہت سے محدثین جن کی ساری عمر خدمت حدیث میں بسر ہوئی ہے، ایک صحیح حدیث کو موضوع اور موضوع کو صحیح لکھ جاتے ہیں، اور اس کی وجہ سے ان کی عیب گیری روا نہیں رکھی جاتی، تو اگر کوئی فقیہ جس کا مطمح نظر صرف فقہ ہے، کسی موضوع حدیث کو صحیح سمجھ کر درج کتاب کر دے، تو اس کی عیب گیری بطریق اولی ناجائز ہوگی۔

کیا مصنف حقیقۃ الفقہ کو معلوم نہیں ہے کہ بڑے بڑے محدثین وحفاظ حدیث نے بہتیری موضوع حدیثوں کو اپنی کتاب میں درج کیا اور بہت بلند آہنگی کے ساتھ اس کی صحت کا اعلان بھی کر دیا۔ اسی طرح بہت [سے] ''ائمہ'' اور ''شیخ الاسلاموں'' نے کتنی صحیح حدیثوں کو بے دھڑک موضوع کہہ دیا۔ آپ کو یہ ضرور معلوم ہوگا پھر آپ نے ان کی عیب گیری کیوں نہیں کی؟ حالانکہ ان کی عیب گیری زیادہ ضروری تھی، اس لیے کہ ان لوگوں نے اس فن میں ماہر اور باکمال ہوتے ہوئے ایسی صریح غلطی کیسے کی؟ اس سے ان کی مہارتِ فن پر حرف آتا ہے۔ اور اگر دیدہ ودانستہ کیا ہے تو اس سے بھی بدتر ہے، مگر سچ یہ ہے ؎

وعين الرضا عن كل عيب كليلة ولكن عين السخط تبدى المساويا

اگر محدثین کی مذکورہ بالا قسم کی غلطیوں کو بالاستیعاب ذکر کرنا چاہوں تو میری یہ تحریر بے حد طویل ہو جائے گی، اس لیے صرف نمونہ کے طور پر حوالے پیش کرتا ہوں:

۱- ابن ماجہ جس پایہ کے محدث ہیں اس کا اندازہ حافظ ذہبی کے ان الفاظ سے ہوسکتا ہے: **الحافظ الكبير المفسر** (تذکرہ ۱۸۹/۲) ابویعلی خلیلی کے الفاظ یہ ہیں: **ابن ماجة ثقة كبير متفق عليه محتج به له معرفة وحفظ** (تذکرہ ۱۸۹/۲) بایں ہمہ ان کی سنن کا یہ حال ہے:

سنن أبي عبدالله كتاب حسن لو لا ما كدره أحاديث واهية (تذکرہ ۱۸۹/۲)	یعنی ابوعبداللہ (ابن ماجہ) کی سنن اچھی کتاب تھی بشرطیکہ اس میں واہیات حدیثیں نہ ہوتیں جن سے یہ کتاب مکدر (گندی) ہوگئی ہے

اور ذہبی ہی نے تاریخ الاسلام میں لکھا ہے:

إنما غض رتبة سننه مافي الكتاب	یعنی سنن ابن ماجہ کا رتبہ ان حدیثوں نے گھٹایا جو

من المناكير وقليل من الموضوعات.	اس میں منکر اور کچھ موضوع کے قبیل سے مذکور ہیں (غیث الغمام ص ۵۶)

۲- ابوعبداللہ حاکم وہ محدث ہیں جن کی نسبت ذہبی کا مقولہ ہے: **الحافظ الكبير إمام المحدثين** (تذکرہ: ۳،۳۲۷) بایں ہمہ مستدرک میں جس کثرت سے انھوں نے موضوع حدیثیں ذکر کی ہیں دنیا جانتی ہے۔ حافظ ذہبی کا ارشاد ہے کہ مستدرک کی ایک چوتھائی حدیثیں موضوعات وواہیات کے قبیل سے ہیں (بستان المحدثین ص......) ذہبی یہ فرماتے ہیں:

ولا ريب أن في المستدرك أحاديث كثيرة ليست على شرط الصحة بل فيه أحاديث موضوعة شان المستدرك بإخراجها فيه (تذکرہ ۲۳۱/۳)	یعنی اس میں کوئی شک نہیں کہ مستدرک میں بکثرت ایسی حدیثیں ہیں جو شرط صحت کے مطابق نہیں، بلکہ اس میں ایسی بھی حدیثیں ہیں جو رسول اللہ ﷺ پر جھوٹ گڑھ لی گئی ہیں حاکم نے ان کو مستدرک میں ذکر کر کے مستدرک کو عیب ناک کر دیا۔

ذہبی یہ بھی فرماتے ہیں:

ليته لم يصنف المستدرك فإنه غض من فضائله بسوء تصرف (تذکرہ ۲۳۳/۳)	یعنی کاش وہ مستدرک تصنیف نہ کرتے، اس لیے کہ اس کتاب نے ان کی وقعت گھٹادی۔

ذہبی کا یہ بھی فرمان ہے کہ بغیر میری تلخیص سامنے رکھے مستدرک کا دیکھنا جائز نہیں ہے (بستان ص......) حالانکہ آپ جانتے ہوں گے کہ مستدرک وہ کتاب ہے جس کو صحیحین کے ٹکر پر حاکم نے لکھنا شروع کیا تھا، اور اس میں انھوں نے اپنے خیال میں صرف وہی حدیثیں ذکر کی ہیں جو صحیحین کی شرط کے مطابق صحیح ہیں، چنانچہ وہ خود فرماتے ہیں: **أجمع كتاباً يشتمل على الأحاديث المروية بأسانيد يحتج بها محمد بن اسماعيل ومسلم بن الحجاج بمثلها،** اور **وانما أستعين الله على إخراج أحاديث رواتها ثقات قد احتج بمثلها الشيخان أو أحدهما** (مستدرک ۳/۱) مستدرک حاکم اور اس کے ساتھ ہی تلخیص ذہبی بھی طبع ہو گئی ہے، میں چاہتا

ہوں کہ تلخیص ذہبی کے بعض مقامات کی بھی آپ کو سیر کراؤں:

(الف) مستدرک کی ایک حدیث کی نسبت امام ذہبی فرماتے ہیں:

أما استحیی المؤلف أن یورد هذا الحدیث الموضوع فأشهد باللّٰه وللّٰه بانه کذب (۲۳۴/۱)	یعنی کیا مؤلف (حاکم) کو اس موضوع حدیث کے ذکر کرنے سے شرم نہ آئی، میں خدا کا نام لے کر خدا ہی کے لیے شہادت دیتا ہوں کہ یہ حدیث جھوٹی ہے۔

(ب) حاکم نے ایک حدیث کی نسبت لکھا ہے: **صحیح الاسناد**، ذہبی لکھتے ہیں:

بل موضوع قبح اللّٰه من وضعه وما کنت أحسب أن الجهل یبلغ بالحاکم إلی أن یصحح هذا (۶۱۷/۱)	یعنی میں (ذہبی) کہتا ہوں کہ یہ حدیث گھڑی ہوئی ہے، جس نے اس کو گھڑا ہے خدا اس کا برا کرے۔ میں نہیں سمجھتا تھا کہ حاکم کی جہالت یہاں تک پہنچ جائے گی کہ اس حدیث کو صحیح کردے گا۔

اللہ اکبر!

حافظ ابن حجر اور ابن دحیہ نے بھی تصریح کی ہے کہ حاکم کی تصنیفات ضعیف اور موضوع احادیث پر مشتمل ہیں (غیث الغمام ص ۵۶) اور شاہ عبدالعزیز صاحب نے مستدرک حاکم کو طبقۂ ثالثہ میں ذکر کیا ہے، اور اس طبقہ کے متعلق فرمایا ہے کہ اس میں موضوع حدیثیں بھی پائی جاتی ہیں اور اس طبقہ کی کتابوں کی اکثر حدیثیں فقہاء کے نزدیک قابل عمل نہیں ہیں، بلکہ ان کے خلاف پر مسلمانوں کا اجماع ہوگیا ہے (عجالہ ص ۷)

۳-سنن دارقطنی، اس کے مصنف فن حدیث میں ایسے ماہر تھے کہ حافظ ذہبی فرماتے ہیں: **الإمام شیخ الاسلام حافظ الزمان** (تذکرہ ۱۸۶/۳) اور ابوالطیب طبری نے ان کو **أمیر المومنین في الحدیث** کہا ہے (تذکرہ ۱۸۸/۳) خطیب نے کہا کہ وہ اپنے زمانہ میں فرد اور امام وقت تھے، حدیث اور اس کی علتوں کی معرفت ان پر ختم ہوگئی (تذکرہ ص ۱۸۷) اس مہارت وکمال کے باوجود ان کی سنن اٹھا کر دیکھئے کس کثرت سے منکر حدیثیں اور بعض موضوع بھی درج ہیں۔ مولوی شمس الحق صاحب ڈیانوی (اہل حدیث) نے حاشیہ دارقطنی میں ایسی حدیثوں کا بے اعتبار ہونا

ظاہر کر دیا ہے۔ ایک حدیث کی نسبت لکھتے ہیں: ''یہ بالکل گری ہوئی سند ہے، اس کا [راوی] **خالد ابن الیاس منکر الحدیث** ہے جیسا کہ بخاری واحمد وابوحاتم نے کہا ہے، اور وہ موضوع حدیثیں روایت کرتا ہے، جیسا کہ ابن حبان نے فرمایا ہے (ص ۱۱۵) ایک حدیث کے متعلق لکھتے ہیں کہ اس میں عیسی بن عبداللہ راوی ہے جس کو خود دارقطنی نے کہا کہ متروک الحدیث ہے (اس کی حدیثیں ترک کر دی گئی ہیں) اور ابن حبان نے کہا موضوع چیزیں بیان کرتا ہے (ص ۱۱۴) ایک اور حدیث کی نسبت فرماتے ہیں کہ اس کی سند میں عمرو بن شمر واقع ہے، جس کو حاکم نے **کثیر الموضوعات** (بہت زیادہ موضوع حدیثیں بیان کرنے والا) اور بخاری نے منکر الحدیث، اور نسائی ودارقطنی وازدی نے متروک الحدیث اور جوزجانی نے کذاب (سخت جھوٹا) کہا ہے۔

یہ تین مثالیں میں نے بطور مشتے نمونہ از خروارے نقل کی ہیں۔ اب میرا سوال ہے کہ امام دارقطنی نے ایسے کذاب ووضاع راویوں کی حدیثیں کیسے نقل کردیں؟ کیا وہ ان کے جھوٹے ہونے سے ناواقف تھے؟ اگر وہ جواب اثبات میں ہے تو ان کی علمیت میں بٹہ لگتا ہے، اور اگر جواب نفی میں ہے تو یہ پہلے سے بھی برا ہے، اس لئے کہ کذابین ووضاعین کی روایت کو جان بوجھ کر درج کرنا گناہ ہے تاوقتیکہ یہ نہ بیان کر دیا جائے کہ اس میں فلاں راوی کذاب ووضاع ہے، **من روی عنی حدیثاً یری أنہ کذب فھو أحد الکاذبین** (مسلم شریف) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو کوئی ایسی حدیث بیان کرے جس کو وہ موضوع اور جھوٹ سمجھتا ہے تو وہ بھی دو جھوٹوں میں ایک ہے (یعنی مجھ پر جھوٹ گڑھنے میں پہلے کا شریک ہے)

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب نے دارقطنی کو بھی طبقۂ ثالثہ میں ذکر کیا ہے۔

(عجالہ نافعہ ص ۷)

۴- بیہقی کی نسبت حافظ ذہبی فرماتے ہیں: **الإمام الحافظ العلامة شیخ خراسان** (تذکرہ ۳/۳۰۹) ان کی تصنیفات میں بھی موضوع حدیثیں ہیں، امام ابن تیمیہ نے منہاج السنۃ میں اس کو صراحۃً لکھا ہے (غیث الغمام ص ۵۶) اور علامہ ابن القیم نے بیہقی کی سنن سے چند حدیثیں نقل کر کے لکھا ہے:

فإنها كلها آثار باطلة موضوعة على رسول اللهﷺ (اعلام ۲/۱۹۶) — یعنی یہ سب باطل حدیثیں اور رسول اللہﷺ پر جھوٹ گڑھی ہوئی ہیں۔

حضرت شاہ صاحب دہلوی نے بیہقی کی تصنیفات کو بھی طبقۂ ثالثہ میں ذکر کیا ہے (عجالہ ص ۷) یہی حال خطیب بغدادی، ابونعیم اصفہانی وغیرہ کی تصنیفات اور مسند فردوس دیلمی کا بھی ہے۔ تفصیل کے لیے منہاج السنۃ ابن تیمیہ حنبلی، تدریب الراوی سیوطی اور اجوبہ فاضلہ کا مطالعہ کیجئے۔

یہ تو ان محدثین کا مختصر تذکرہ تھا جو موضوع اور بناوٹی حدیثوں کو بے تامل صحیح کہہ دیتے ہیں۔ اب ذرا ان محدثین پر بھی ایک نظر ڈال لیجئے جو صحیح حدیثوں کو بلکہ صحیحین کی روایات کو بے دھڑک موضوع لکھ جاتے ہیں، علامہ سخاوی فتح المغیث میں لکھتے ہیں:

ربما أدرج ابن الجوزي في الموضوعات الحسن والصحيح مما هو في أحد الصحيحين الخ — یعنی بسا اوقات حسن اور صحیحین میں سے کسی ایک کی روایت کو بھی ابن جوزی موضوعات میں درج کر جاتے ہیں۔

(اجوبہ فاضلہ ص ۵۲)

سخاوی کے علاوہ اور محدثین کو بھی ابن جوزی سے یہ شکایت ہے۔

اس قسم کے لوگوں میں امام ابن تیمیہ حنبلی بھی ہیں:

فإنه جعل بعض الأحاديث الحسنة مكذوبة وكثيراً من الأخبار الضعيفة موضوعة (اجوبہ ص ۵۳) — یعنی انھوں نے حسن حدیثوں کو جھوٹی اور بہت سی ضعیف حدیثوں کو بالکل موضوع قرار دے دیا

ابن تیمیہ کی اس عادت کا حافظ ابن حجر نے الدرر الكامنة اور لسان الميزان میں ذکر کیا ہے۔

ان تمام باتوں سے میرا مقصد صرف اتنا ہے کہ بڑے بڑے محدثین سے اس قسم کی حرکتیں دانستہ یا نادانستہ ہوگئی ہیں، پس اگر یہ کوئی عیب ہے تو سب سے پہلے مصنف ''حقیقۃ الفقہ'' کو ان کی عیب گیری کرنی چاہئے۔ اور حقیقۃ المحدثین نام کی ایک کتاب تصنیف کر کے ہر ہر گاؤں میں اس کی

ایک ایک جلد بھیج کر تمام لوگوں کو ان خطرات سے آگاہ کردینا چاہئے جو ان کی تصنیفات سے پیدا ہوسکتے ہیں۔

اسی فصل میں مصنف ''حقیقۃ الفقہ'' [نے] ایک عنوان یہ قائم کیا ہے ''صاحب ہدایہ کا افترا'' اوراس کے ماتحت ایک اپنے ہم نوالہ وہم پیالہ شخص کی کتاب تنقید الہدایہ کے اقتباسات درج کیے ہیں۔کوئی اس عقلمند مصنف سے پوچھے کہ ''تنقید الہدایہ'' کے غیر مقلد مصنف کے اقوال کسی حنفی کے نزدیک کب قابل تسلیم ہوسکتے ہیں؟ بھلا بتاؤ تو کہ تمہارے دعویٰ پر تمہارے ہی ہم مذہب غیر مقلد کی شہادت دینی یا دنیاوی کس قانون کی رو سے قابل سماعت ہوسکتی ہے؟ علاوہ بریں ''تنقید الہدایہ'' کے مصنف نے یہ تو کہیں نہیں لکھا کہ ''صاحب ہدایہ نے یہ افترا کیا ہے'' اس نے تو صرف یہ لکھا ہے کہ ''جو کچھ صاحب ہدایہ نے روایت ذکر کی ہے عمر سے......سو وہ افترا ہے عمر پر (حقیقۃ الفقہ ص ۱۱۰) اس میں کہاں تصریح ہے کہ صاحب ہدایہ کا یہ افترا ہے، بہت ممکن ہے کہ مصنف تنقید الہدایہ کا یہ مطلب ہو کہ کسی نے افترا کردیا ہے اور صاحب ہدایہ اس کو بلا تحقیق نقل کر گئے ہیں۔اور اگر آپ کو اپنی ہی بات پر اصرار ہے تو ہم کہیں گے کہ پھر جہاں جہاں مستدرک حاکم کی تلخیص میں حافظ ذہبی نے بل موضوع کہا ہے، وہاں بھی یہی مطلب ہوگا کہ وہ سب حدیثیں خود حاکم نے رسول اللہ ﷺ پر افترا کی ہیں۔ اور حاکم کے علاوہ اور مصنفین بھی جن کا نام میں نے لیا ہے وہ سب بھی مفتری ہوں گے (معاذ اللہ)

اس کے علاوہ مصنف ''تنقید الہدایہ'' کا اس روایت کو افترا کہنا اس کی ناواقفیت وجہالت کی دلیل ہے۔حافظ ابن حجر نے درایۃ میں ہدایہ سے روایت کے الفاظ نقل کرکے لکھا ہے **مسلم والترمذي من طريق أبي إسحاق** (ص ۲۳۵) یعنی اس روایت کو مسلم وترمذی نے ابواسحاق کے طریق سے روایت کیا ہے۔اور صاحب ہدایہ کے ذکر کیے ہوئے الفاظ میں سے کسی لفظ کا نہ انکار کیا ہے نہ استثناء، پس معلوم ہوا کہ ان کو اس روایت کے کسی لفظ کے ثبوت میں کلام نہیں ہے۔

اثنا عشری امامی شیعہ مذہب کے خدوخال

تحریر: سید محب الدین خطیب مصری ترجمہ: مسعود احمد الاعظمی

(تیسری قسط)

عقیدۂ حکومت

حضراتِ ابوبکر وعمر وصلاح الدین ایوبی اور وہ تمام لوگ جنھوں نے اسلام کے لیے ملکوں کو فتح کیا اوران کو اللہ کے دین میں داخل کیا، اور جن لوگوں نے ان ممالک پر اسلام کے نام سے حکمرانی کی اور آج تک کرتے چلے آرہے ہیں، یہ سب کے سب شیعوں کے اس عقیدے کے مطابق جس پر وہ اللہ کا سامنا کریں گے، ظالم، غاصب اور جہنم میں جانے والے (نعوذ باللہ) حکمران ہیں، اس لیے کہ یہ سب غیر شرعی (غیر قانونی) حکمراں تھے، اور شیعوں کی دوستی، سچی اطاعت اور تعاون علی الخیر کے مستحق نہیں تھے، مگر وہیں تک جہاں تک ان کا عقیدۂ تقیہ، مطلب برآری کی لالچ اور دوستی کے پردے میں دشمنی کی اجازت دیتا ہے۔ شیعوں کے بنیادی عقائد میں سے یہ ہے کہ جس وقت مہدی (ان کے بارہویں امام) نمودار ہوں گے، جو اس وقت بھی زندہ ہیں اور شیعہ ان کے خروج کے منتظر ہیں، یعنی ان کے انقلاب کا انتظار کر رہے ہیں، تاکہ ان کے انقلاب کے ساتھ شیعہ بھی انقلاب برپا کردیں، وہ لوگ جب ان کا اپنی کتابوں میں ذکر کرتے ہیں تو ان کے نام یا لقب یا کنیت کے ساتھ یہ دو حرف ''عج'' لکھا کرتے ہیں، جس کا مطلب ''عجل اللّٰہ فرجه'' (اللہ ان کی کشادگی میں جلدی کرے) ہے، یہ مہدی جب اپنی طویل نیند سے بیدار ہوں گے جو کہ ایک ہزار ایک سو سال سے زیادہ عرصہ سے ہے، اور اللہ تعالیٰ ان کے لیے اور ان کے آبا واجداد کے لیے ان کے ہم عصر حاکموں کے ساتھ گزشتہ تمام حکام کو بھی اٹھائے گا۔ جن میں سرفہرست جبت اور طاغوت یعنی ابوبکر وعمر اور ان کے بعد کے لوگ ہوں گے۔ تو وہ ان سے اپنی اور اپنے گیارہ امام آبا واجداد کی حکومت غصب کرنے کا حساب لیں گے، کیوں کہ آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد سے قیامت تک اسلام میں حکومت کا حق اللہ کی طرف سے صرف ان ائمہ کو حاصل ہے، اور اس میں کسی کا کوئی حق اور

حصہ نہیں ہے، ان غاصب طاغوتوں کا فیصلہ کرنے کے بعد ان سے انتقام لیں گے، اور ایک ساتھ پانچ سو حاکموں کے قتل کا حکم صادر کریں گے، یہاں تک کہ پورے اسلامی عہد کے تین ہزار حاکموں کو موت کے گھاٹ اتار دیں گے، یہ سب کچھ دنیا کے اندر قیامت میں اٹھائے جانے سے پہلے ہوگا، پھر لوگوں کے مرنے اور قتل ہونے کے بعد حشر میں لوگ اٹھیں گے، پھر یا جنت میں جائیں گے، یا دوزخ میں، جنت اہل بیت کے واسطے اور ان لوگوں کے لیے ہوگی جو ان کے بارے میں یہ عقیدے رکھتے ہیں، اور دوزخ ہر اس شخص کے لیے ہوگی جو شیعہ نہیں ہے، شیعہ اس اٹھنے، فیصلہ کرنے اور بدلہ لینے کو ''رجعت'' کے نام سے یاد کرتے ہیں، اور یہ ان کے ان بنیادی عقائد میں سے ہے، جس میں کسی شیعہ کو کوئی شک وشبہ نہیں ہے، میں نے بعض خوش فہم لوگوں کو یہ خیال کرتے ہوئے دیکھا ہے کہ شیعہ آخری زمانے میں اس عقیدے سے دست بردار ہوگئے ہیں، یہ ایک بڑی غلطی ہے جو حقیقت کے بالکل خلاف ہے۔

شیعیت سے شیوعیت کی طرف

شیعہ لوگ صفوی حکومت کے زمانے سے اب تک ان مذکورہ بالا عقائد پر پہلے سے زیادہ سختی کے ساتھ جمے ہوئے ہیں، اور اس وقت ان کے اندر دو طبقہ ہے، یا تو وہ لوگ ہیں جو ان تمام باتوں پر ایمان ویقین رکھتے ہیں، یا وہ لوگ ہیں جنھوں نے عصری تعلیم حاصل کی جس کی وجہ سے انھوں نے ان خرافات سے روگردانی کر کے شیوعیت (کمیونزم) کی پناہ لی، چنانچہ عراق کے کمیونسٹ اور ایران کی ''تودہ پارٹی'' کے لوگ ان شیعوں کی اولاد ہیں جن کی نگاہ میں ان افسانوں کی حقیقت واضح ہوگئی، تو وہ کمیونسٹ بن گئے جب کہ وہ پہلے شیعہ تھے۔ ان کے اندر کوئی درمیان کی جماعت نہیں ہے، سوائے ان کے جو اپنے مذہبی یا سیاسی یا جماعتی یا ذاتی مقاصد کے لیے تقیہ کرتے ہیں، اور جو ان کے دل میں ہوتا ہے اس کے خلاف ظاہر کرتے ہیں۔ ان کی معتبر کتابوں سے ان کے ''عقیدۂ رجعت'' سے واقف کرانے کے لیے میں شیعوں کے شیخ ابوعبداللہ محمد بن محمد النعمان - جو ان کے ہاں **الشیخ المفید** کے نام سے مشہور ہیں - ان کی کتاب **الإرشاد في تاريخ حجج الله على العباد** کے صفحہ ۳۹۸-۴۰۲ سے ایک قول نقل کرتا ہوں، یہ سنگی طباعت سے ایران میں چھپا ہوا ایک قدیم ایڈیشن ہے [۱]، جس پر تاریخ مذکور نہیں ہے، لیکن محمد علی محمد حسن کلبا یکائی کا کتابت کیا ہوا ہے، اس میں ہے کہ:

---

(۱) ایرانی دستور کی دفعہ پانچ میں ہے کہ: ''امام مہدی - عجل اللہ فرجہ - کی غیبت میں اسلامی جمہوریۂ ایران کے اندر حکومت اور امت کی نگہبانی کا حق عادل فقیہ کے لیے ہوگا (سعید اسماعیل)

فضل بن شاذان نے محمد بن علی کوفی سے روایت کیا، اس نے وہب بن حفص سے، اس نے ابوبصیر سے، کہا کہ ابوعبداللہ (یعنی جعفر صادق) نے قائم (قائم سے شیعوں کے وہ بارہویں امام مراد ہیں جن کے بارے میں ان کا عقیدہ یہ ہے کہ وہ گیارہویں صدی پہلے پیدا ہوئے ہیں اور وہ مرے نہیں ہیں اس لیے کہ وہ عنقریب اٹھیں گے اور حکومت کریں گے) تو ابوعبداللہ یعنی جعفر صادق قائم کا نام لے کر تیئیسویں کی رات کو پکارتے ہیں اور عاشوراء (دس محرم) کے دن کھڑے ہوتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ: ایسا لگتا ہے کہ قائم کو دس محرم کے دن مقام ابراہیم اور کعبہ کے درمیان کھڑا دیکھتا ہوں، جبرئیل ان کے داہنے ہاتھ ہیں، اور وہ آواز لگاتے ہیں کہ البیعة للّٰه (اللہ کے واسطے بیعت کرو)۔ اس آواز پر شیعہ زمین کے گوشے گوشے سے اس طرح چل پڑیں گے کہ زمین ان کے واسطے سمیٹ دی جائے گی، یہاں تک کہ وہ ان کے ہاتھ پر بیعت کریں گے، اور یہ منقول ہے کہ وہ مکہ سے چل کر کوفہ آئیں گے، اور ہمارے نجف میں قیام کریں گے، پھر وہاں سے شہروں میں فوجیں بھیجیں گے۔ اور حجال نے ثعلبہ سے، اس نے ابوبکر حضرمی سے، اس نے ابوجعفر علیہ السلام (یعنی محمد باقر) سے روایت کیا ہے، باقر نے کہا گویا میں قائم علیہ السلام کو نجف کوفہ میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں، کہ پانچ ہزار فرشتوں کے سائے میں مکہ سے چل کر نجف پہنچے ہیں، جبرئیل ان کے داہنے ہاتھ اور میکائیل بائیں طرف ہیں، اور مومن لوگ ان کے سامنے ہیں، اور وہ شہروں میں فوجیں روانہ کرر ہے ہیں۔ اور عبدالکریم جعفی نے کہا کہ میں نے ابوعبداللہ (یعنی جعفر صادق) سے پوچھا کہ قائم علیہ السلام کتنی مدت تک حکومت کریں گے؟ انھوں نے جواب دیا کہ سات سال، دن لمبے ہو جائیں گے یہاں تک کہ ان کے عہد حکومت کا ایک سال آج کل کے تمھارے دس سال کی طرح ہوگا، لہٰذا ان کی حکومت کی مدت تمھارے آج کل کے سال کے اعتبار سے ستر برس ہوں گے، ابوبصیر نے ان سے کہا کہ میری جان آپ پر قربان ہو، یہ تو بتلا دیجئے کہ اللہ سالوں کو کس طرح دراز کردے گا؟ فرمایا کہ: اللہ تعالیٰ آسمان کو ٹھہر جانے اور حرکت کم کردینے کا حکم دے گا، اس طرح دن اور سال لمبے ہو جائیں گے۔ اور جب ان کے ظہور کا وقت ہوگا تو جمادی الآخرہ کے مہینے میں اور رجب کے دس دنوں میں خوب بارش ہوگی، اتنی بارش کہ اب تک مخلوقات نے اتنی بارش نہیں دیکھی ہوگی، لہٰذا اللہ تعالیٰ مومنین کے گوشت اور ان کے جسموں کو ان کی قبروں میں اگائیں گے، گویا میں ان کو آتے ہوئے اور اپنے بالوں سے مٹی کو جھاڑتے ہوئے دیکھ رہا ہوں۔ اور عبداللہ بن المغیرہ نے ابوعبداللہ (یعنی جعفر صادق) علیہ السلام سے روایت کیا کہ انھوں نے کہا کہ آل محمد میں سے قائم جب اٹھیں گے تو قبیلۂ قریش کے پانچ سو آدمیوں کو کھڑا کریں گے اور ان کی

گردن ماریں گے، پھر دوسرے پانچ سو لوگوں کے ساتھ یہی کریں گے، چھ مرتبہ یہی عمل کریں گے، میں نے پوچھا کہ کیا ان لوگوں کی تعداد اتنی ہوگی؟ (اس تعداد پر راوی کو اس وجہ سے تعجب ہوا کہ خلفاء راشدین اور خلفاء بنی امیہ و بنی عباس اور جعفر صادق کے زمانے تک کے تمام حکام کی تعداد اس تعداد کے سویں حصے تک بھی نہیں پہنچتی) جعفر صادق نے جواب دیا کہ ہاں، ان سے اور کے موالی (آزاد کردہ غلاموں) سے ملا کر۔ اور ان ہی سے ایک دوسری روایت ہے کہ ہماری حکومت آخری حکومت ہوگی، اور کوئی گھرانہ ایسا نہیں ہوگا جس نے ہم سے پہلے حکومت نہ کی ہو، تاکہ ہمارے کردار کو دیکھ کر وہ یہ نہ کہہ سکیں کہ جب ہم بادشاہ ہوں گے، تو ان ہی لوگوں کے طرز پر حکومت کریں گے۔ اور جابر جعفی نے ابوعبداللہ سے روایت کیا کہ جب آل محمد میں سے قائم اٹھیں گے، تو وہ خیمے نصب کریں گے، جن کے اندر وہ اس طرح قرآن پڑھائیں گے، جس طرح وہ نازل ہوا ہے (۱)۔ اس کو اس طرح پڑھنا سب سے زیادہ سخت اس کے لیے ہوگا جس نے اس کو آج یاد کیا (یعنی جس طرح اس کو لوگوں نے مصحف عثمانی سے یاد کیا ہے) اس لیے کہ وہ قرآن اور اس کا پڑھنا ان کی انسیت کے خلاف ہوگا۔ اور عبداللہ بن عجلان نے ابوعبداللہ سے روایت کیا کہ انھوں نے کہا کہ جب آل محمد میں سے قائم اٹھیں گے تو لوگوں میں داود والا فیصلہ کریں گے (۲)۔ اور مفضل بن عمر نے ابوعبداللہ سے روایت کیا کہ قائم علیہ السلام کے ساتھ کوفہ کی پشت سے ستائیس آدمی موسی (علیہ السلام) کی قوم سے اٹھیں گے، سات اہل کہف کے اور یوشع بن نون، سلیمان، ابودجانہ انصاری، مقداد اور مالک اشتر، یہ سب لوگ ان کے آگے آگے مددگار اور حکام ہوں گے۔

یہ تمام عبارتیں حرف بحرف اور پوری امانت کے ساتھ شیعوں کے علماء میں سے ایک بڑے عالم جو کہ شیخ مفید ہیں ان کی کتاب سے نقل کی گئی ہیں، یہ عبارتیں ایسی سندوں سے روایت کی گئی ہیں، جو - بے شک وشبہہ - ان اہل بیت کی طرف منسوب کر کے گھڑی گئی ہیں، جن کی سب سے بڑی مصیبت یہ تھی کہ یہ بڑے بڑے دروغ گو اور جھوٹے لوگ ان کے خاص ساتھی اور مددگار تھے، شیخ مفید کی یہ کتاب ایران میں چھپی ہے، اور اس کا قدیم نسخہ محفوظ اور موجود ہے۔

(جاری ہے)

---

(۱) اگر ایسا ہوگا تو ان کے دادا حضرت علی بن ابی طالب نے اپنے عہد خلافت میں یہ کیوں نہیں کیا، کیا ان کے بارہویں پوتے قرآن اور اسلام کے ان سے زیادہ وفادار ہیں؟

(۲) حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اس فیصلے کو پسند نہیں کیا ہے اور فرمایا ہے ﴿وَظَنَّ دَاوُدُ اَنَّمَا فَتَنّٰهُ فَاسْتَغْفَرَ رَبَّهٗ وَخَرَّ رَاكِعًا وَّاَنَابَ﴾

عالم برزخ

مولانا ہلال احمد مالیگاؤں

دنیا کی زندگی کو''عالم شہادہ'' کہتے ہیں۔اس عالم میں جسم غالب ہوتا ہےاور روح مغلوب ہوتی ہے،موت کے وقت روح قبض ہونے کے بعد قیامت کے واقع ہونے تک کا وقفہ عالم برزخ کہلاتا ہے،اس عالم میں روح غالب ہوتی ہےاور جسم مغلوب ہوتا ہے،اور قیامت کے بعد کی زندگی عالم آخرت کہلاتی ہے،اس عالم میں جسم اور روح دونوں یکساں ہوتے ہیں۔

عالم برزخ میں روحیں مخصوص مقامات میں رہتی ہیں،اوراس عالم میں روحوں کا تعلق اپنے اجسام ((یا اجسام کے اجزاء) کے ساتھ ہوتا ہےاوراس عالم برزخ میں بھی ان کے ساتھ راحت ونعمت اور عذاب کا معاملہ ہوتا ہے۔اس پر امت مسلمہ کا اجماع ہے،لیکن غیر مقلدین کا ایک فرقہ ہے جو احادیث کے حجت ہونے کا انکار کرتا ہے(حالانکہ احادیث میں کثرت کے ساتھ عالم برزخ میں عذاب وثواب کے معاملے کا تذکرہ ہے)۔یہ فرقہ کہتا ہے کہ قرآن مجید میں عذاب قبر کا کہیں ذکر نہیں ہے،جب کہ قرآن مجید میں بھی عالم برزخ کےعذاب کا صراحةً ذکر ملاحظہ ہو:**فَوَقٰهُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِ مَا مَكَرُوْا وَحَاقَ بِاٰلِ فِرْعَوْنَ سُوْٓءُ الْعَذَابِ ۝ اَلنَّارُ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَّعَشِيًّا ۚ وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ ۫ اَدْخِلُوْٓا اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ۝**

ترجمہ: پھر بچالیا(موسیٰ) کو اللہ نے برے داؤ سے جو وہ کرتے تھے اور الٹ پڑا فرعون والوں پر بری طرح کا عذاب۔وہ آگ ہے کہ دکھلا دیتے ہیں ان کو صبح اور شام اور جس دن قائم ہوگی قیامت حکم ہوگا داخل کرو فرعون والوں کو سخت سے سخت عذاب میں۔(سورۃ المومن آیت نمبر ۴۵،۴۶ پارہ نمبر ۲۴)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا: کہ آل فرعون کی روحیں سیاہ پرندوں کی شکل میں ہر روز صبح اور شام دو مرتبہ جہنم کے سامنے لائی جاتی ہیں اور جہنم کو دکھلا کر ان سے کہا جاتا ہے کہ تمھارا ٹھکانہ یہ ہے۔(مصنف عبدالرزاق،ابن ابی حاتم،تفسیر مظہری)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تم میں سے کوئی مرجاتا ہے تو عالم برزخ میں صبح وشام اس کو وہ مقام دکھلایا جاتا ہے جہاں قیامت کے حساب کے بعد اس کو پہنچنا ہے اور یہ مقام دکھلا کر روزانہ اس سے کہا جاتا ہے کہ تجھے آخرکار یہاں پہنچنا ہے۔ اگر یہ شخص اہل جنت میں سے ہے تو اس کا مقامِ جنت اس کو دکھلایا جائے گا اور اہل جہنم میں سے ہے تو اس کا مقامِ جہنم اس کو دکھلایا جائے گا (متفق علیہ)

مذکورہ آیت دلیل ہے عذاب قبر کی اور احادیث کی روایاتِ متواترہ اور اجماع امت اس پر شاہد ہیں۔

عالم برزخ میں مقامِ "عِلّیّین وسِجّین"

جب کسی انسان کی موت آتی ہے تو فرشتے اس کی روح کو لے کر مقام علیین یا مقام سجین میں پہنچا دیتے ہیں جہاں وہ حشر کے میدان میں جمع ہونے تک رہیں گی۔ نیک لوگوں کی روحیں مقام علیین میں پہنچائی جاتی ہیں اور برے لوگوں کی روحیں مقام سجین میں پہنچائی جاتی ہیں۔ اور ہر روح کا تعلق اس کے بدن (یا بدن کے اجزاء) سے ہوتا ہے، اس پر جو نعمتیں یا عذابات ہوتے ہیں اس کا اثر روح پر بھی ہوتا ہے اور جسم پر بھی ہوتا ہے۔ مقام علیین اور سجین میں روحیں بھی رہتی ہیں اور ان کا دفتر (اعمال نامہ) بھی ہوتا ہے۔

ارواح کے رہنے کی جگہ میں روایتیں مختلف ہیں اور سب صحیح ہیں اور علماء کے اقوال بھی اس بارے میں کئی طرح کے ہیں، لیکن تحقیق کرنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ حقیقت میں ان روایتوں میں کوئی اختلاف نہیں، سب روایتیں اپنی اپنی جگہ پر صحیح اور درست ہیں، علامہ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے اس معاملہ کو خوب سمجھایا ہے اور تحقیق سے بیان کیا ہے جس سے روایتوں کی صحت اور موافقت ظاہر ہوگئی۔

جاننا چاہئے کہ ارواح چار قسم کی ہیں: ایک قسم ارواحِ انبیاء علیہم السلام کی، دوسری قسم ارواحِ مومنینِ صالحین کی، تیسری قسم ارواحِ بدکار مومنین کی اور چوتھی قسم ارواحِ کفار ومشرکین کی۔ اور جاننا چاہئے کہ موت کے بعد جہاں ارواح رہتی ہیں اس جگہ کو سوائے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے دوسرا نہیں جانتا ہے نہ بیان کرسکتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شب معراج میں دونوں عالم کی سیر کی، ارواح سے ملاقات کی اور اللہ تعالیٰ نے کتنی باتوں سے آپ کو آگاہ کیا، اس واسطے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بارے میں جو

کچھ بیان کیا ہے وہی حق ہے۔اور اصحابِ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے جو کچھ بیان کیا ہے اس کو پیغمبر علیہ السلام سے سن کر بیان کیا ہے اپنی رائے کو دخل نہیں دیا ہے اور جب کہ روح دنیا کی چیزوں کے مثل نہیں ہے اور نہ دیکھنے میں آسکتی ہے، اس واسطے اس کو دنیا کی کسی چیز پر قیاس کرنا اور اندازہ لگانا نہایت ہی غلطی ہے، جیسے جو شخص بھوک پیاس کو لکڑی پتھر پر قیاس کرے یا خوشی غمی کو درخت اور پہاڑ پر قیاس کرے تو کہا جائے گا یہ شخص جاہل اور بے عقل ہے۔

جب یہ سب باتیں معلوم ہوگئیں تو اب سمجھنا چاہئے کہ انسان نے دنیا میں رہ کر جیسے اعمال کیے ہیں اس کے موافق اس کی روح اپنے درجہ میں رکھی جاتی ہے، بعض ارواح علیین کے اعلیٰ درجہ میں رہتی ہیں، یہ پیغمبروں کی روحیں ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے معراج کی رات میں ان لوگوں سے ملاقات کی ہے۔بعض ارواح کو سبز چڑیوں کی پیٹھ پر جگہ دی جاتی ہے، یہ جنت میں رہتی ہیں اور جہاں چاہے وہاں چلی جاتی ہیں، یہ وہ شہید ہیں جو جہاد میں قتل کیے گئے اور اُن پر کسی کا قرض نہیں ہے، اور جن پر کسی کا حق باقی رہ گیا ہے وہ جنت میں داخل ہونے سے محروم رہ جائیں گے۔

روایت ہے محمد بن عبداللہ سے کہ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا یا رسول اللہ اگر میں اللہ کی راہ میں شہید ہوں تو مجھ کو کیا بدلہ ملے گا آپ نے فرمایا جنت، جب وہ لوٹ کر چلے تو آپ نے اُن کو بلا کر فرمایا اگر تجھ پر کسی کا قرض نہ ہو، یہ حکم جبریل نے ابھی مجھ کو سنایا ہے۔بعض ارواح جنت کے دروازے پر رہیں گی۔بعض اپنی قبروں میں بند رہیں گی اور اُن پر ثواب وعذاب ہوتا رہے گا اور بعض ارواح ساتوں طبقوں کے نیچے قید کی جائیں گی اور عذاب میں گرفتار ہوں گی، یہ روحیں مشرکین اور کفار کی ہوں گی۔بعض ارواح آگ کے تنور میں عذاب کی جائیں گی اور بعض خون کی نہر میں جیسا کہ عذابِ قبر میں بیان ہوا۔پیغمبر اور شہید جنت میں رہتے ہیں اور اللہ کے حکم واجازت سے جہاں چاہے جاتے ہیں، ان کے سوا اور لوگوں کی روحیں برزخ میں رہتی ہیں اور ان کا تعلق قبر سے رہتا ہے اور ثواب ملتا ہے یا عذاب ہوتا ہے، اسی کو ثوابِ قبر یا عذابِ قبر کہتے ہیں۔

علیین:

اس مقام میں وسعت، فراخی اور کشادگی ہے، نیک لوگوں کی ارواح میں سے ہر ایک روح بلند بالا اور وسیع مکان میں ہے، مکان جتنا بلند ہوگا لازماً اتنا ہی وسیع وفراخ بھی ہوگا۔علیین ساتویں

آسمان کے اوپر واقع ہے، اس کا نچلا حصہ سدرۃ المنتہیٰ کے پاس ہے اور اوپر کا سرا عرشِ مجید کے دائیں پائے کے متصل ہے، نیک لوگوں کی ارواح قبض کرنے بعد وہیں لے جائی جاتی ہیں، اور ان کے اعمال نامے وہاں پہنچانے اور ان کے نام وہاں درج کر لینے کے بعد اپنے اپنے درجات کے مطابق ان کو مختلف مقامات میں رکھا جاتا ہے۔

ارواح کا اپنی قبور سے تعلق ہوتا ہے:

اور ان ارواح کا اپنی قبر سے بھی ایک تعلق ہوتا ہے، چنانچہ قبر پر آنے والے لوگوں اور دوست واقرباء کی ان کو اطلاع ہو جاتی ہے، اس لیے کہ روح کو اطلاع حاصل کرنے میں مقام اور جگہ کے قریب یا دور ہونے سے کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی، اس کی مثال انسان کے وجود میں روحِ بصری (یعنی نگاہ) ہے کہ ساتوں آسمانوں کے ستاروں کو کنویں کے اندر سے دیکھ سکتی ہے (اسی طرح روح کو سمجھ لیں) جب مقام علیین ایسا ہے کہ اس تک انسانی عقل کی رسائی نہیں ہو سکتی جب تک خود باری تعالیٰ نہ بتا دیں، اس لیے اس کی تفسیر سوال وجواب کے انداز میں ارشاد فرماتے ہیں: ''وَمَا اَدْرٰکَ مَا عِلِّیُّوْنَ o کِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ o'' ترجمہ: اور تجھ کو کیا خبر ہے کیا ہے علیین، ایک دفتر لکھا ہوا، یعنی وہ لکھا ہوا اور علامت لگایا ہوا دفتر ہے کہ اس علامت کو دیکھتے ہی ہر شخص پہچان لے کہ یہ شخص جنتی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ (وہ دفتر) ایک زمرد کی سبز کھدی ہوئی تختی ہے جو عرش معلیٰ کے دائیں پائے سے لٹک رہی ہے اُس کا پائین سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچا ہوا ہے، اور وہ دفتر اللہ کے خاص بندوں کے حوالے ہے۔

سجین:

سجین میں تنگی گھٹن اور ازدحام ہے، ایک مکان کے اندر اگر جم غفیر جمع ہو جائے تو اس میں تنگی اور ازدحام پیدا ہو جائے گا۔ سجین، سجن سے مبالغے کا صیغہ ہے، سجن قید خانے کو کہتے ہیں، وہ جگہ جہاں اس دفتر (فائل) میں اندراج ہوتا ہے وہ نہایت تنگ وتاریک جگہ ہے، دوزخیوں کی ارواح کا قید خانہ بھی وہی ہے، اسی لیے اس دفتر (فائل یا رجسٹر) کا نام بھی سجین رکھ دیا، چنانچہ مزید اس کی تحقیق بیان فرماتے ہیں ''وَمَا اَدْرٰکَ مَا سِجِّیْنٌ o کِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ o''، ترجمہ: اور تجھ کو کیا خبر ہے کیا ہے سجین،

ایک دفتر لکھا ہوا، یعنی سجین ایک دفتر (رجسٹر، فائل) جس میں ہر دوزخی کا نام درج ہوتا ہے اور بندوں کے عمل لکھنے والے فرشتے جن کا ذکر اس سے پہلی سورت میں آچکا ہے، ان بدکاروں کے مرنے اور ان کا عمل منقطع ہونے کے بعد ہر شخص کے اعمال علیحدہ علیحدہ فردوں (کاغذوں) میں لکھ کر اس بڑے دفتر (رجسٹر، فائل) میں داخل کرتے اور پھر اس فرد پر یا ہر ایک دوزخی کے نام پر ایک علامت بنا دیتے ہیں جس کے دیکھتے ہی معلوم ہو جائے کہ یہ شخص دوزخی ہے۔

اصل لغت میں ''رقم'' اس علامت کو کہتے ہیں جو کپڑے کی تجارت کرنے والے کپڑے کے تھان پر لگا دیتے ہیں (سکہ یا لیبل) تا کہ فروخت کرتے وقت اس کی قیمت کی پہچان رہے۔

سجین کے متعلق بعض ضعیف احادیث میں مزید تفصیل آئی ہے چنانچہ کعب احبار رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ سجین کے نام سے جو دفتر موسوم ہے وہ ساتوں زمینوں کے نیچے ہے، وہاں ایک سیاہ پتھر پڑا ہے، اس سے بدبو اور دھواں نکل رہا ہے، جو شیطان اذکار و انوار سے بھاگتے ہیں وہ اسی جگہ جا کر ٹھہرتے ہیں، بدکاروں کی روح قبض کرنے کے بعد آسمانوں پر لے جائی جاتی ہے، مگر آسمان کے دربان جب اس کے لیے دروازے نہیں کھولتے تو واپس زمین پر اس کو لایا جاتا ہے، یہاں بھی اس کے لیے جب کوئی ٹھکانہ نہیں ملتا تو آخر کار ساتوں زمین کے نیچے اسی پتھر کے نیچے اس کو رکھا جاتا ہے، جو فرشتے اس کے دفتر (سجین) پر مقرر ہیں وہ اس کا نام اس دفتر میں لکھ لیتے ہیں کہ فلاں بن فلاں اس تاریخ کو دنیا سے برزخ میں پہنچا اور یہ یہ اعمال ساتھ لایا، اور اس کے اعمال کی فردیں (فہرستیں) کراماً کاتبین کے روزنامچے سے لے کر اس دفتر میں داخل کر دیتے ہیں تا کہ قیامت کے دن یہ سب اس کے بائیں ہاتھ میں دیا جائے، اور بدکاروں کی روحیں اسی جگہ رہتی ہیں اور ان کو طرح طرح کی اذیتیں دی جاتی ہیں۔

[مراجعات: تفسیر عزیزی پارہ عم، معارف القرآن، قبر کے حالات: مصنف حضرت مولانا محمد عیسیٰ صاحب]

مصلائے نبی ﷺ ومنبر شریف اور قدیم مسجد نبوی کے حدود وحرم شریف میں آگ کے واقعہ کا تذکرہ

تحریر: جمال الدین محمد بن احمد المطری　　ترجمہ: مولانا انور رشید الاعظمی استاذ مرقاۃ العلوم، مئو

محمد بن الحسن بن زبالہ سے شیخ محبّ الدین نجار کو منبر نبی ﷺ کے متعلق یہ بات معلوم ہوئی کہ وہ ابتدا میں دو ہاتھ اور تین انگشت کے بقدر لمبا تھا، چوڑائی ایک ہاتھ تھی، اور آپ منبر کے جس حصہ پر ٹیک لگاتے تھے، اس کی لمبائی ایک ہاتھ تھی، منبر کی دونوں گھنڈیاں جو بہ شکل انار تھیں اور جنھیں آپ ﷺ منبر پر تشریف رکھنے کے وقت اپنے دستِ مبارک سے پکڑتے تھے، ایک بالشت دو انگلی کے بقدر لمبی تھیں، چوڑائی ایک ہاتھ یا اس سے زائد تھی، اس کا مربع حصہ برابر تھا، اور سیڑھیوں کی تعداد (بیٹھنے کی جگہ کو شامل کرکے) تین تھی، جس میں تینوں جانب سے پانچ پائے تھے۔

میں کہتا ہوں کہ منبر نبوی کی یہ مذکورہ ہیئت نبی اکرم ﷺ کی حیات مبارکہ میں اور حضرات ابوبکر وعمر وعثمان رضی اللہ عنہم کے عہد مبارک میں تھی، مگر جب حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنی خلافت کے زمانہ میں حج کیا تو اس کو قبطی کپڑے سے ڈھک دیا، اس کے بعد اس وقت کے مدینہ منورہ کے عامل مروان کو لکھا کہ منبر کو زمین سے اونچا کردیں، چنانچہ انھوں نے اس کام کے لیے بڑھئی بلوائے جنھوں نے اس کو زمین سے بلندی پر کردیا، اور اس کے نچلے حصہ سے چھ سیڑھیاں بڑھا کر اس کو اونچا کردیا۔ اس طرح منبر کی مجلس (بیٹھنے کی جگہ) کو شامل کرکے نو سیڑھیاں ہوگئیں، ابن زبالہ کہتے ہیں کہ مروان سے پہلے یا بعد میں کسی نے منبر کے اندر کوئی اضافہ نہیں کیا، میں کہتا ہوں کہ یہ محمد بن حسن بن زبالہ کے وقت کی بات ہے، اور ابن زبالہ ہی سے یہ بھی منقول ہے کہ منبر نبی ﷺ کی لمبائی اضافہ کے بعد چار ہاتھ تھی، اور چوکھٹ کے زیریں حصہ سے اس کے بالائی حصہ تک ۹ ہاتھ ایک بالشت تھا، ابن زبالہ کا یہ بھی

بیان ہے کہ مہدی بن منصور نے ۱۶۱ھ میں جس وقت حج کیا تو امام مالک بن انس رضی اللہ عنہ سے کہا کہ میری خواہش ہے کہ منبر نبوی ﷺ کو اس کی پہلی حالت پر کردوں، تو ان سے امام مالک نے کہا کہ وہ درخت کے کچھ ٹکڑے ہیں جن میں لکڑیاں شامل کر کے اس کو مضبوط و مستحکم کیا گیا ہے، مجھے اندیشہ ہے کہ اگر تم انھیں اکھیڑو گے تو وہ گر جائے گا، اس لیے میں اس کے اندر کسی ترمیم و تبدیلی کو مناسب نہیں سمجھتا، چنانچہ مہدی نے اس کو اس کی حالت پر باقی رکھا، اور ارادہ سے باز آ گیا، میں کہتا ہوں کہ مدینہ منورہ کے جوار میں رہنے والوں کی اولاد میں سے بعض طلبہ جن سے میری ملاقات ہے، اس کا نام یعقوب بن ابوبکر بن اوحد ہے، اس کا بیان ہے کہ اس کے والد ابوبکر مسجد نبوی کی نگرانی اور دیکھ بھال کی خدمت پر مامور تھے، انھیں کے ہاتھوں مسجد نبوی میں آگ لگی تھی، جس کے نتیجہ میں وہ خود بھی اسی رات مسجد کے اسٹور میں آگ کی لپیٹ میں آ گئے، یہ منبر جس میں امیر معاویہ نے اضافہ کر کے منبر نبی ﷺ کو اس سے بلند کیا زمانہ کے دراز ہونے کے سبب گر گیا، اور بنی عباس میں سے بعض خلفاء [(۱)] نے اس کی تجدید کی، اور منبر نبی ﷺ کی بچی کھچی لکڑیوں سے کنگھیاں بنائیں تا کہ ان سے برکت حاصل کریں، اور ابن نجار نے جس منبر کے بنائے جانے کا شروع میں تذکرہ کیا ہے تاریخ مدینہ میں اس کے متعلق مذکور ہے کہ لمبائی تین ہاتھ ایک بالشت اور تین انگل تھی، اور چبوترہ جس پر منبر قائم تھا وہ سنگ مرمر کا تھا، جس کی لمبائی ایک بالشت تھی، اور اس کی محراب اوپر سے چوکھٹ تک پانچ ہاتھ، ایک بالشت اور چار انگشت تھی، جس میں اس وقت دو چوکھٹوں کا اضافہ ہو گیا ہے اور ایک دروازہ بھی بنایا گیا ہے جو جمعہ کے روز کھلتا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ جس منبر میں آگ لگی تھی وہ اس منبر کے علاوہ کوئی اور منبر تھا جس کو امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے بنایا تھا اور اس کے اوپر منبر نبوی ﷺ کو رکھا تھا، فقیہ یعقوب بن ابوبکر [(۲)] کہتے ہیں کہ یہ بات میں نے مدینہ منورہ کے جوار میں رہنے والی ایک جماعت

---

(۱) وہ آخری عباسی خلیفہ احمد عبداللہ مستعصم ہے جس کو مغلوں نے قتل کیا تھا، جن کی قیادت ہلاکو کر رہا تھا، یہ واقعہ ۶۵۶ھ کا ہے جب مغلوں نے بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجادی تھی، یہ خلیفہ انتہائی کمزور تھا، ملکی امور کے نفاذ میں اس سے زیادہ اس کے وزیر ابن العلقمی کا دخل تھا۔

(۲) یہ وہی ابوبکر ہیں جن کی مسجد نبوی کے آگ والے واقعہ میں جلنے سے موت واقع ہوئی تھی۔

سے سنی ہے جن سے میری ملاقات ہوئی ہے اور جن پر اعتبار کیا جاسکتا ہے، ان لوگوں نے ان سے سنا ہے جن سے ان کی ملاقات ہے، اور یہ کہ بعض خلفاء نے منبر کی تجدید کی اور نبیٔ کریم ﷺ کے منبر کے باقی حصے (لکڑیاں وغیرہ) تبرکاً رکھ لیے تھے، کیونکہ خلیفۂ مذکور نے اسی جلنے والے منبر کی تجدید کی تھی، اور وہ وہی ہے جس کو شیخ محبّ الدین بن نجار نے حرم شریف میں آگ لگنے کے واقعہ سے پہلے پایا تھا، کیونکہ شیخ محبّ الدین کی وفات ماہ شعبان ۶۴۳ھ میں ہوئی، اور مسجد نبوی میں آگ زنی کا واقعہ شب جمعہ یکم رمضان ۶۵۴ھ میں پیش آیا، جس کی ابواحمد عبداللہ خلیفہ مستعصم کو مدینہ منورہ سے تحریری اطلاع دی گئی، چنانچہ خلیفہ نے عراق کے حجاج کے ذریعہ کاریگر اور دیگر ساز وسامان بھیجے اور ۶۵۵ھ میں تعمیر کا آغاز ہوا۔

حرم شریف کی پوری چھت آگ کی لپیٹ میں آگئی، چھت کی کوئی ایک لکڑی بھی صحیح وسالم باقی نہ بچی، البتہ ستون اپنی جگہ قائم رہے، جو کھجور کے تنہ کے مانند نظر آرہے تھے، ہوائیں چلتیں تو ایسے بل کھاتے تھے جس طرح کھجور کے تنے بل کھاتے ہیں، سیسے آپس میں پگھل کر گر گئے، اور حجرۂ مبارکہ کی چھت بھی نبیٔ اکرم ﷺ کے مکان کی چھت پر گر پڑی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ دونوں چھتیں مبارک قبروں پر آگریں، جب لوگوں نے حرم شریف کی تعمیر کا آغاز کیا تو ان چھتوں کے جو حصے ان مقدس قبروں پر گرے تھے ان کو وہاں سے ہٹانا چاہا، لیکن (ان اشیاء کے مبارک ومقدس ہونے کے سبب) اس کی ہمت نہ کرسکے، بالآخر امیر مدینہ منیف بن شیحہ بن ہاشم بن قاسم بن مہنا اور حرم شریف کے بزرگ مجاورین وخدام کے اتفاق سے یہ تجویز رکھی گئی کہ خلیفہ مستعصم کی نگرانی میں اور ان کی رائے اور ان کے حکم کے مطابق عمل کیا جائے، چنانچہ ان کو اس سلسلہ کا خط بھیج کر جواب کا انتظار کیا گیا مگر خلیفہ کی جانب سے جواب نہ موصول ہوا، بلکہ خلیفہ اور ارباب حکومت کو تاتاریوں کے حملہ اور ملک پر قبضہ کرنے کی کوشش نے تشویش واضطراب میں ڈال دیا، اس لیے حرم شریف کا وہ ملبہ (جس کا اوپر ذکر ہوا) جیسا تھا اسی حالت میں چھوڑ دیا گیا، کسی نے اس کو وہاں سے ہٹانے کی زحمت نہیں کی، بلکہ اسی حالت میں ان ستونوں کے اوپر جو حجرۂ مبارکہ کے آس پاس تھے، چھت قائم کردی، کیونکہ وہ دیوار جس کو عمر بن عبدالعزیز ؒ نے نبیٔ اکرم ﷺ کے مکان کے آس پاس ان ستونوں کے درمیان تعمیر کی تھی جو نبیٔ اکرم ﷺ کے مکان کے اردگرد تھے، وہ چھت کے بالائی حصہ تک نہیں پہنچی تھی، بلکہ دیوار کے

اوپر اور ستونوں کے درمیان چوبی کھڑکی بنائی جو دیوار سے چھت کی بلندی تک تھی، یہ کھڑکی غور کرنے سے اس پردے کے نیچے سے جو دیوار پر پڑے تھے، پوری دیوار کے آس پاس گھومنے سے نظر آرہی تھی، اسی سال (۶۵۵ھ میں) حجرۂ مبارکہ اور اس سے متصل حصہ جنوبی دیوار تک، اور مشرقی دیوار باب جبریل تک - جو زمانۂ قدیم میں باب عثمان رضی اللہ عنہ - سے مشہور تھا، اور مغربی سمت سے روضۂ اقدس کا مکمل حصہ منبر شریف تک مسقّف بنایا گیا، بعد ازاں محرم ۶۵۶ھ میں بغداد کا وہ سانحہ پیش آیا جس میں خلیفہ مستعصم کو قتل کیا گیا[1]، اسی زمانہ میں مصر سے ساز وسامان (تعمیر سے متعلق) مدینہ منورہ پہنچا، اس وقت مصر میں منصور نورالدین علی بن معز عزالدین ایبک صالحی حکمراں تھا، اسی طرح یمن کے بادشاہ مظفر شمس الدین یوسف بن منصور نورالدین عمر بن علی بن رسول کی طرف سے تعمیری سامان لکڑیاں وغیرہ مدینہ منورہ لائے گئے، اور باب السلام تک تعمیر کی گئی، باب السلام کی زمانہ قدیم میں باب مروان ابن حکم سے شہرت تھی، اُدھر مصر کا مذکور الصدر بادشاہ تخت شاہی سے معزول کر دیا گیا اور تخت شاہی پر اس کے والد کا غلام ملک مظفر سیف الدین قطز المعزی متمکن ہوا، جس کا حقیقی نام محمود بن ممدود تھا، اس کی والدہ سلطان جلال الدین خوارزم شاہ کی بہن تھی، اور اس کے والد اس کے چچا زاد بھائی تھے جو تاتاریوں کے بغداد پر قبضہ کے وقت قید کر لیے گئے تھے، پھر دمشق میں بیچ دیے گئے وہاں سے فروخت ہو کر مصر پہنچے اور ۶۵۸ھ میں مسند آرائے مملکت ہوئے، اسی سال (۶۵۸ھ) میں رمضان کے مہینہ میں عین جالوت کا واقعہ پیش آیا[2] جس میں اللہ رب العزت نے اسلام اور اسلام کے ماننے والوں کو غلبہ عطا فرمایا، عزت و وقار بخشا، اور کفر اور اس کے نام لیواؤں کو مذکورہ بادشاہ کے ہاتھوں ذلت آمیز شکست سے دوچار ہونا پڑا، مذکورہ بادشاہ (مظفر سیف الدین) نے ابھی مکمل ایک سال بھی حکومت نہیں کی تھی کہ اس واقعہ (عین جالوت) کے ایک مہینہ بعد اس وقت قتل کر دیا گیا جب وہ مصر میں داخل ہو رہا تھا، اس کے قتل کے بعد مسجد نبوی کا بقیہ تعمیری کام اس سال باب السلام سے باب الرحمۃ تک مکمل ہوا، اس وقت باب الرحمۃ باب عاتکہ بنت عبداللہ بن یزید بن معاویہ کے نام سے

---

(۱) مستعصم آخری عباسی خلیفہ تھا جس کو ہلاکو نے ۶۵۶ھ میں بغداد میں قتل کیا۔

(۲) عین جالوت: وہ مشہور واقعہ ہے جس میں مغلوں کو غلام بادشاہوں کے ہاتھوں، فلسطین کے شہر نابلس کے قریب عین جالوت کے مقام پر عالم اسلام میں داخل ہونے کے بعد پہلی مرتبہ شکست فاش سے دوچار ہونا پڑا اور یہ واقعہ ۶۵۸ھ مطابق ۱۲۵۸ء میں پیش آیا۔

مشہور تھا، اس نسبت کا سبب عاتکہ کا مکان تھا جو اس باب کے بالمقابل تھا، جس طرح باب عثمان اور باب مروان کی نسبت ہے۔

اسی سال کے اخیر میں ملک ظاہر رکن الدین بیبرس [۱] صالحی نے- جو بندوق داری کے نام سے مشہور تھا- مصر کی زمام اقتدار سنبھالی، اور اپنے عہد حکومت میں مسجد نبوی کا بقیہ کام مکمل کیا، جو باب رحمت سے جانبِ شمال تک، اور وہاں سے باب النساء تک تھا، اور مسجد کو اس سابقہ حالت پر کردیا جیسی وہ آگ لگنے کے واقعہ سے پہلے تھی، مسجد اسی حالت پر برقرار رہی، یہاں تک کہ ۷۰۵ھ و ۷۰۶ھ میں یعنی دو سال کے عرصہ میں جو سلطان ملک ناصر محمد بن قلاوون [۲] صالحی کا زمانہ تھا، مسجد کے مشرقی اور مغربی سطح کی تعمیر جدید کی گئی اور چھت کے دونوں حصوں کو جانب شمال والی چھت کے برابر کردیا۔

۶۵۶ھ میں والیٔ یمن ملک مظفر نے ایک منبر بنایا اور اس کو منبر نبی کے مقام پر نصب کردیا جو ۶۶۶ھ تک موجود رہا (منبر کی دونوں گھنڈیا صندل کی تھیں) پھر ملک ظاہر نے والیٔ یمن کے منبر کو ہٹا کر دوسرا منبر نصب کیا جو ابھی تک موجود ہے، اس کا طول چار ہاتھ ہے، اوپر سے چوکھٹ تک کا حصہ زائد از سات ہاتھ ہے، زینوں کی تعداد بھی سات ہے، ایک روایت جو حدتواتر کو پہنچی ہے وہ یہ ہے کہ مصلائے نبوی اور منبر شریف اور وہ مقام جہاں آپ وفات سے پہلے تک نماز ادا فرماتے تھے، ان کا فاصلہ ترپین ہاتھ ہے، شیخ محبّ الدین بن نجار نے اہل سیر کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے مسجد نبوی کی دوبار تعمیر فرمائی، ایک تو اس وقت جب آپ مدینہ منورہ تشریف لائے، اس وقت کی مسجد کی لمبائی و چوڑائی سو ہاتھ سے کم تھی، دوبارہ اس وقت تعمیر فرمایا جب اللہ رب العزت نے آنحضور ﷺ کو خیبر کی فتح سے مشرف فرمایا اور سابقہ تعمیر کے بقدر اس میں اضافہ فرمایا، مسجد میں آپ ﷺ نے سولہ ماہ تک بیت المقدس کی جانب رخ کرکے نماز ادا کی، بعد میں تحویل قبلہ کا حکم آیا تو آپ ﷺ نے ایک جماعت کو مسجد کے گوشوں میں اس مقصد کے لیے مقرر فرمایا تاکہ قبلہ [۳] کو سیدھا اور برابر کیا جاسکے، بالآخر جبریل علیہ

(۱) بیبرس صالحی: ظاہر بیبرس بندوق داری مملوک بادشاہ تھا ۶۵۸ھ و ۶۷۶ھ عین جالوت کے معرکہ میں سلطان قطز کے لشکر کا کماندار تھا، فوج اور تعمیرات اور ڈاک پر اس کی خاص توجہ تھی۔

(۲) سلطان ناصر محمد بن قلاوون (۶۹۳ھ-۶۹۴ھ) مصر کے مملوک بادشاہوں میں سے تھے، ایک سے زائد بار مصر پر حکومت کی، مصنف نے جس دور کا تذکرہ کیا ہے وہ دوسرے دور حکومت کی بات ہے جس کا زمانہ ۶۹۸ھ تا ۷۰۸ھ ہے۔

(۳) قبلہ کی صحیح سمت متعین کرنے کے لیے ایک صندوق تھا۔

السلام تشریف لائے اور آنحضور ﷺ سے فرمایا کہ آپ قبلہ والا صندوق رکھ دیں آپ کو کعبہ نظر آئے گا پھر جبریل علیہ السلام نے وہ سارے پہاڑ جو آپ ﷺ کے اور قبلہ کے درمیان حائل تھے ہٹا دیے چنانچہ آنحضور ﷺ نے وہ صندوق رکھ دیا تو آپ کعبہ کو اس طرح دیکھ رہے تھے کہ کوئی بھی شیئ آپ کے اور کعبہ کے درمیان حائل نہیں تھی، فراغت کے بعد جبریل علیہ السلام نے فرمایا کہ یونہی قبلہ ہے، پھر پہاڑ اور درخت اور دیگر اشیاء کو ان کی پہلی حالت پر کر دیا، اور قبلہ کی سمت میزاب کو قرار دیا۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم ﷺ کا قبلہ ملک شام کی جانب تھا، اور مصلی جہاں سے آپ ﷺ لوگوں کی نماز میں امامت فرماتے تھے، وہ بھی ملک شام کی جانب تھا، وہ اس طرح کہ اگر ہم وہ اسطوانہ جو خوشبوؤں میں بسا ہوا ہے اپنے پشت کی جانب کر کے ملک شام کی جانب چلیں، اور باب عثمان - جو باب جبریل سے مشہور ہے - ہمارے مقابل ہو، اور جب صحن مسجد میں ہوں تو وہ باب ہمارے دائیں مونڈھے کے برابر ہو، تو یہی مقام قبلہ ہے اور اس وقت ہم محراب نبی میں ہوں گے۔

میں کہتا ہوں کہ خوشبوؤں میں بسا ہوا اسطوانہ وہ ہے جو مصلائے رسول ﷺ میں نماز ادا کرنے والے امام کے دائیں سمت میں واقع ہے، جس کا تذکرہ ستونوں کے تذکرہ کے ضمن میں آئے گا۔

شیخ محبّ الدین رحمۃ اللہ علیہ (ابن نجار مراد ہیں) بیان کرتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ کی پہلی مسجد کے حدود جانب قبلہ سے وہ حاجز ہیں جو ان ستونوں کے درمیان ہیں جو روضہ کے قبلہ والی سمت میں ہیں، اور ملک شام کی جانب سے وہ دو لکڑیاں ہیں جو صحن مسجد میں نصب کی گئی ہیں، یہ مسجد کا طول ہے، رہا مسجد کا عرض تو وہ مشرق سے مغرب کی جانب حجرۂ مبارکہ سے شروع ہو کر اس ستون تک ہے جو منبر کے بعد ہے۔

میں کہتا ہوں کہ جن حواجز کا قبلہ والی سمت میں ذکر ہوا ہے وہ قبلہ والی دیوار کے مقام سے آگے ہیں، کیونکہ قبلہ والی دیوار رسول اکرم ﷺ کی محراب کے مقابل ہے، جیسا کہ یہ بات علم میں آچکی ہے کہ جو شخص رسول اکرم ﷺ کی محراب میں کھڑا ہوگا تو منبر شریف والی گھنڈی اس کے دائیں کندھے کے برابر ہوگی اور اس بات پر اتفاق ہے کہ نہ تو مقام نبی ﷺ کے اندر کوئی تغیر ہوا ہے اور نہ

منبر شریف اپنی پہلی جگہ سے ہٹایا گیا ہے، البتہ وہ صندوق جو رسول اکرم ﷺ کے مصلیٰ کے سامنے رکھا گیا ہے تو وہ اس محراب اور اسطوانہ کے درمیان سترہ قائم کرنے کے لیے ہے، اور یہ بات بھی معلوم ہے کہ قبلہ کی سمت والی دیوار اور منبر کے درمیان عام گذرگاہ ہے، اور منبر اور حواجز کے درمیان سوا چار ہاتھ کے بقدر فاصلہ ہے۔

مسجد نبوی کے صحن میں آج کل دو پتھر ہیں جن کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ وہ رسول اکرم ﷺ کے عہد مبارک کی مسجد نبوی کی ملک شام اور مغربی سمت کی حد ہے، لیکن یہ دونوں پتھر منبر کی محاذاۃ میں نہیں ہیں، بلکہ مشرقی سمت سے چار ہاتھ یا اس سے کچھ کم مسجد کے اندر داخل ہیں واللہ اعلم، اسی طرح وہ دونوں قبلہ کی جانب اتنی ہی مقدار میں آگے بھی ہیں، (اور یہ بات میں اس لیے کہہ رہا ہوں) کیونکہ میں نے اس کا بذریعہ پیائش اندازہ کیا ہے تو میں نے دیکھا کہ یہ دونوں مسجد کی پہلی حدود ومقیاس پر نہیں ہیں۔

شیخ محبّ الدین بن النجار کا بیان ہے کہ رسول اکرم ﷺ کی مسجد کا طول اضافہ کے بعد دوسو پچاس ہاتھ ہے، اور اس کا عرض اس کے خلفی حصہ سے ایک سو پینتیس ہاتھ ہے، پچھلا حصہ اگلے حصہ سے ۳۵ ہاتھ کم ہے، محمد بن حسن کا بیان بھی (اس سلسلہ میں) اسی کے قریب اور مشابہ ہے، کیونکہ ہاتھ میں بھی اختلاف اور فرق ہوتا ہے، اور یہ ساری تفصیل درمیانہ ہاتھ کے اعتبار سے ہے، طویل وقصیر ہاتھ کے اعتبار سے نہیں۔

روضۂ جنت کے مشہور اسطوانات کا تذکرہ

اسطوانۂ مخلقہ:

یہ وہ ستون ہے جس میں نبیٔ اکرم ﷺ نے تحویل قبلہ کے بعد دس دن سے زائد عرصہ تک فرض نماز ادا فرمائی، اس کے بعد آپ اس محراب کی طرف نماز کے لیے متوجہ ہوئے جس کا گذشتہ سطروں میں تذکرہ ہوا، اور وہ منبر شریف اور قبر مبارک سے تیسرا ہے، اور مسجد کے قبلہ کی جانب دو سائبانوں کے اضافہ سے پہلے تک مسجد کے صحن سے بھی تیسرا تھا، وہ روضہ کے وسط میں واقع ہے اسطوانۂ مہاجرین کے نام سے مشہور ہے، اکابر صحابہ اس میں نماز بھی پڑھتے تھے اور ان کی مجلسیں بھی وہاں منعقد ہوتی تھیں، اس کی شہرت اسطوانۂ عائشہ رضی اللہ عنہا سے بھی ہے، جس کا سبب وہ حدیث پاک ہے

جس کو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا روایت فرماتی ہیں کہ: اگر لوگوں کو اس اسطوانہ کی عظمت وفضیلت کا پتہ چل جائے تو لوگ وہاں نماز ادا کرنے کے لیے قرعہ اندازی کریں، اور انھوں نے یہ جگہ اپنے بھانجے حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کو بتائی تھی، اسی لیے وہ اکثر وبیشتر وہاں نوافل ادا کرتے تھے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس مقام پر دعا قبول ہوتی ہے۔

اسطوانۂ توبہ:

یہی وہ اسطوانہ ہے جس سے حضرت ابولبابہ بشیر[1] بن عبدالمنذر انصاری اوسی رضی اللہ عنہ نے اپنے کو باندھ رکھا تھا، اہل سیر کا بیان ہے کہ نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب رمضان میں اعتکاف فرماتے تو اسطوانۂ توبہ کے پیچھے آپ کے لیے بستر لگایا جاتا اور وہیں چارپائی ڈال دی جاتی۔

میں کہتا ہوں کہ یہ اسطوانہ قبر شریف کی جانب سے دوسرا، اور جانب قبلہ سے تیسرا، اور منبر کی سمت سے چوتھا، اور مسجد کے صحن کی طرف سے پانچواں ہے، اور یہی وہ اسطوانہ ہے جو اسطوانۂ مہاجرین سے (جس کا ابھی تذکرہ ہوا) مشرقی جہت سے متصل ہے، اس پہلی صف میں جو اس امام کے پیچھے ہے جو مصلائے نبی میں نماز پڑھتا ہے، اور شمال کی جہت سے اس کے پیچھے اسطوانۂ امیر المؤمنین علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ ہے جو اسطوانہ محرس سے بھی مشہور ہے، کیونکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کے لیے وہاں بیٹھ کر پہرہ دیا کرتے تھے اور وہ اس چھوٹے دروازہ کے مقابل میں ہے جس سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم روضۂ جنت میں نماز ادا کرنے کے لیے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے گھر سے نکلتے تھے، اس کے پیچھے شمالی جہت سے اسطوانۂ وفود ہے، یہ وہ ستون ہے جہاں آپ عرب کے اُن وفود کے لیے تشریف رکھتے تھے، (جو آپ کے پاس مشرف بہ اسلام ہونے کے لیے) آیا کرتے تھے، یہ ستون اس وقت مسجد کے صحن سے متصل تھا جب مسجد کے جانب قبلہ والی جہت میں موجود دو سائبانوں کا اضافہ نہیں ہوا تھا، یہ ستون مجلس قلادہ سے بھی مشہور تھا یہاں افاضل واجلۂ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین تشریف رکھتے تھے اور ان کی مجلسیں ہوتی تھیں۔

(جاری ہے)

---

(۱) ابولبابہ بشیر بن عبدالمنذر انصاری اوسی رضی اللہ عنہ جلیل القدر صحابی ہیں، جس وقت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ بدر کے لیے تشریف لے گئے تو آپ نے انھیں مدینہ کا امیر مقرر فرمایا، اور مال غنیمت سے ان کو بھی ایک حصہ دیا تھا، طویل زندگی پائی، حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت تک باحیات رہے، (ابن سعد: ۳۴۹/۷)

قتل غیرت (HONOUR KILLING)

عہد جاہلیت کی نامسعود یادگار

از: ڈاکٹر عبدالمعید صاحب، کھیری باغ روڈ، مئو

مفتی محمد ثناء الہدیٰ قاسمی نائب ناظم امارت شرعیہ کا مضمون ''غیرت کے نام پر قتل وغارت گری'' جو روزنامہ انقلاب کے ۱۲/اگست ۲۰۱۶ء شمارہ میں ص۱۲ پر شائع ہوا ہے، اس اہم اور حساس موضوع پر اب تک کسی عالم دین کی تحریر نظر سے نہیں گزری جب کہ موجودہ حالات کے تناظر میں اس کی اشد ضرورت تھی، اس لیے امارت شرعیہ جیسے باوقار ادارے کے ذمہ دار کی تحریر نے مزید اشتیاق پیدا کردیا، راقم سطور نے بڑے ذوق وشوق سے پڑھا، مضمون پڑھ کر حد درجہ مایوسی ہوئی، توقع تھی کہ قرآن وحدیث کی روشنی میں قتل غیرت کا جائزہ لیا ہوگا اور شریعت کی روشنی میں مسلم معاشرہ کو مفید مشوروں سے نوازا ہوگا لیکن مفتی صاحب کا مضمون ایک عام صحافی کی طرح عامیانہ اور کم تر مواد پر مشتمل بلکہ ایک طرح سے ''قتل غیرت'' کی خاموش تائید پر مبنی تھا۔ مفتی صاحب اپنے تمہیدی کلمات میں تحریر فرماتے ہیں:

> ''غیرت انسان کے ان اوصاف میں ہے، جو ہر ایک کے نزدیک پسندیدہ ہے، غیرت کی وجہ سے بہن، بیٹی، ماں اور وطن تک کی عزت وآبرو کا تحفظ ہوتا ہے، بے غیرت انسان کو ان چیزوں کی فکر نہیں ہوتی، کسی کے ساتھ کچھ ناز یبا سلوک ہو جائے، کسی کی عزت وآبرو داؤ پر لگ جائے، بے غیرت انسان کی پیشانی پر بل نہیں آتا اور وہ ہر حال میں جو کچھ ہے اور جیسا کچھ ہے، قبول کرتا رہتا ہے، لیکن باعزت انسان خاندان اور ملک وملت کی عزت کو اور اس کے بس میں جو کچھ ہوتا ہے کر گزرتا ہے۔''

ذرا آگے تحریر فرماتے ہیں:

''آج بھی انسانوں میں غیرت باقی ہے، وہ اپنے خاندان کی عزت کے لیے سب کچھ داؤ پر لگا دیتا ہے اور معاملہ قتل وخون ریزی تک جا پہنچتا ہے۔ ابھی حال ہی میں پاکستانی ماڈل قندیل بلوچ کے بارے میں یہ خبر آئی کہ اس کے بھائی نے اس کی بے راہ روی دیکھ کر اس قندیل کو ہی بجھا دیا جو کبھی .... چنانچہ اس کے بھائی نے فوزیہ عظیم عرف قندیل بلوچ کو قتل کر دیا۔''

شرعی ذمہ داری سے پہلوتہی کرتے ہوئے آخر میں تحریر فرماتے ہیں:

''میں اس موضوع پر یہاں بحث نہیں کرنا چاہتا کہ یہ عمل غلط ہے یا صحیح، برصغیر ہندوپاک کے تناظر میں دیکھیں تو ان ممالک کے اپنے قوانین ہیں، تعزیرات کے دفعات ہیں، اوران میں اس کی کوئی گنجائش نہیں۔''

مفتی صاحب اپنی اس تحریر سے امت مسلمہ کو کیا پیغام دینا چاہتے ہیں سمجھ سے بالاتر ہے ؎

اٹھا میں مدرسہ وخانقاہ سے نمناک نہ زندگی نہ محبت نہ معرفت نہ نگاہ

قتل ایک نا قابل معافی جرم:

قتل اللہ کی نگاہ میں کس قدر ظلم اور بڑا گناہ ہے، اس کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے کہ جب اللہ رب العزت نے فرشتوں سے فرمایا کہ میں زمین پر اپنا خلیفہ بنانے والا ہوں تو فرشتوں نے انسانوں کی کسی اور برائی کے تذکرہ کے بجائے قتل وخوں ریزی کا نام لیا۔

فرشتے کہنے لگے کیا آپ پیدا کریں گے زمین میں ایسے لوگوں کو جو فساد کریں گے اور خوں ریزیاں کریں گے۔(البقرۃ آیت نمبر ۳۰)

اسلام کی نگاہ میں سب سے بڑا گناہ اللہ کے ساتھ شرک اور کفر ہے، اس کی سزا ہمیشہ کے لیے دوزخ ہے، جو شخص کفر کی حالت میں دنیا سے چلا جائے، اس پر جنت کے دروازے بند ہیں اور ہمیشہ کے لیے دوزخ کی آتشیں آغوش اس کی رفیق رہے گی۔ کفر کے بعد ایک ہی عمل ہے جس کے بارے میں فرمایا گیا کہ اس کا مرتکب ہمیشہ ہمیشہ دوزخ میں رہے گا، اس پر اللہ کا غضب ہوتا رہے گا اور اللہ کی لعنت برستی رہے گی:

''اور جو شخص کسی مسلمان کو قصداً قتل کرے تو اس کی سزا دوزخ ہے کہ مدتوں اس میں رہے گا

اور اس پر اللہ غضبناک ہوگا اور اس پر لعنت کرے گا اور اس نے اس کے لیے زبردست عذاب تیار کر رکھا ہے''۔ (النساء: ۹۳)

کتنی لرزہ براندام کردینے والی ہے یہ آیت! لیکن اس شخص کے لیے جس کے دل میں خوف خداوندی کا کوئی گوشہ موجود ہو۔ قتل غیرت کے مرتکب اور اس کے ہمنوا غور فرمائیں۔

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ: امید ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر گناہ کو معاف فرمادیں گے، سوائے اس کے کہ کوئی شخص شرک کی حالت میں مرے یا کسی مسلمان کو جان بوجھ کر قتل کردے۔

(ابوداؤد حدیث نمبر: ۴۲۷۰)

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس نے کسی مومن کو قتل کیا، اللہ تعالیٰ نہ اس کی کوئی فرض نماز قبول فرمائیں ے اور نہ نفل۔

(ابوداؤد حدیث نمبر: ۴۲۷۰)

اور کیوں نہ ہو کہ ایک مومن کی زندگی اللہ کے نزدیک دنیا و مافیہا سے زیادہ اہم ہے۔

اس سے اندازہ کیجئے کہ مومن کے خون کی کیا حرمت اور عظمت ہے؟ اور کسی مسلمان کی جان لینا کیسی لعنت اور غضب الٰہی کو دعوت دینا ہے، اس لیے حضور ﷺ نے فرمایا:

مومن برابر دین کے معاملہ میں وسعت و گنجائش میں رہتا ہے، جب تک کسی خون حرام کا مرتکب نہ ہو۔ (بخاری، حدیث نمبر: ۶۸۶۲)

جیسے قتل کرنا گناہ ہے، اسی طرح قتل میں تعاون بھی گناہ ہے، بلکہ اگر کسی شخص نے دوسرے کو قتل پر اکسایا ہو، یا دوسرے کو قتل پر استعمال کیا ہو، تو اس کا گناہ اصل قاتل سے بھی بڑھ کر ہے، ایک بار آپ ﷺ سے قاتل اور قتل کا حکم دینے والے کے بارے میں دریافت کیا گیا تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جہنم کے ستر حصے کیے جائیں گے جن میں انہتر (۶۹) حصہ قتل کا حکم دینے والے کے لیے ہوگا اور ایک حصہ خود اس قاتل کے لیے اور یہ ایک حصہ بھی اس کے لیے بہت کافی ہوگا۔

''وللقاتل جزء وحسبہ'' (مسند احمد، حدیث نمبر: ۲۲۵۵۷ عن مرثد بن عبداللہ)

نہ صرف یہ کہ قتل پر اکسانا اور ابھارنا بہت بڑا گناہ ہے، بلکہ مقتول کو بچانے کی کوشش نہ کرنا اور پہلو تہی سے کام لینا بھی انسان کو اللہ تعالیٰ کی لعنت کا مستحق بنا دیتا ہے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن

عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جہاں کسی شخص کا ظلماً قتل ہو، وہاں تم کھڑے نہ ہو۔ وہاں موجود رہنے والوں پر بھی اللہ کی لعنت ہوتی ہے، کہ انھوں نے اسے بچایا کیوں نہیں؟ اور جہاں کسی کو ظلماً زدوکوب کیا جارہا ہو، وہاں بھی نہ ٹھہرو، کیوں کہ حاضرین پر بھی اللہ کی لعنت ہوگی کہ انھوں نے مدافعت کیوں نہیں کی۔ (طبرانی فی الکبیر، حدیث نمبر: ۱۱۶۷۵)

اصل یہ ہے کہ کسی شخص کو قتل کرنا اس بات کی علامت ہے کہ اس کی زندگی میں انسانی خون اور انسانی زندگی کا احترام نہیں اور یہ بہت ہی خطرناک بات ہے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ ایک نفس انسانی کا قتل پوری انسانیت کو قتل کرنے اور ایک انسان کو بچانا پوری انسانیت کو بچانے کے مترادف ہے:

''جس نے کسی شخص کو بغیر قصاص کے یا زمین میں فساد پھیلانے (یعنی خوں ریزی اور ڈاکہ زنی وغیرہ کی سزا) کے (بغیر ناحق) قتل کردیا تو گویا اس نے (معاشرے کے) تمام لوگوں کو قتل کرڈالا اور جس نے اسے (ناحق مرنے سے بچا کر) زندہ رکھا تو گویا اس نے (معاشرے کے) تمام لوگوں کو زندہ رکھا (یعنی اس نے حیات انسانی کا اجتماعی نظام بچالیا''۔(المائدہ:۳۲)

اس جرم کے شدید ہونے کی وجہ ظاہر ہے کہ زندگی اللہ کی امانت ہے، جان دینا اور جان لینا اللہ ہی کا حق ہے، قاتل گویا اللہ کا حق اپنے ہاتھ میں لے لیتا ہے۔اس سے بڑھ کر تعدی کیا ہوگی؟

اسی لیے اللہ تعالیٰ نے انتقام کا قانون رکھا کہ یا تو خود قاتل کو کیفر کردار تک پہنچا دیا جائے (البقرۃ:۱۷۸)۔اگر مقتول کے اولیاء رضامند ہوجائیں تو ان کو دیت ادا کی جائے، جو سو اونٹ یا اس کی قیمت ہے، احادیث میں اس کی تفصیل موجود ہے، مقصد اس دیت کا یہی ہے کہ ایک شخص کی قتل کی وجہ سے مقتول کے خاندان کو جو نقصان پہنچا ہے وقتی طور پر سہی، کچھ تو اس کی اشک شوئی ہوجائے اور ہنگامی مدد تو حاصل ہوجائے، یہ خون بہا اس وقت بھی واجب ہے، جب کسی شخص کو دھوکہ میں قتل کردے (النساء:۹۲) اور اس غلطی کی صورت میں صرف دیت ہی کافی نہیں، بلکہ کفارہ بھی واجب ہے کہ مسلسل دو ماہ روزہ رکھے جائیں۔(النساء:۹۲)۔اگر جان بوجھ کر قتل کیا ہو تو اس کے لیے کوئی کفارہ متعین نہیں کیا گیا، زندگی بھر توبہ استغفار کرتا رہے، کیوں کہ یہ اتنا بڑا جرم اور شدید گناہ ہے کہ کوئی عمل اس کا کفارہ نہیں بن سکتا۔

رسول اللہ ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع سے مسلمانوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ:

آج کونسا دن ہے؟ یہ کون سا مہینہ ہے؟ اور یہ کون سی جگہ ہے؟ پھر فرمایا کہ یہ حرام مہینہ، حرام دن اور حرام سرزمین یعنی حدود حرم کا علاقہ ہے۔ اس کے بعد ارشاد فرمایا کہ مسلمان کی جان و مال اور عزت و آبرو اس سے بھی زیادہ قابل حرمت ہیں۔ (بخاری، حدیث نمبر: ٦٧)

(انقلاب ٦ / مارچ ۲۰۱۵ء ص ٧ ''وہ گناہ جو کبھی معاف نہ ہوگا'' از: مولانا خالد سیف اللہ رحمانی)

''حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا کہ آپ بیت اللہ شریف کا طواف کر رہے ہیں اور (بیت اللہ سے خطاب کرتے ہوئے) یہ فرما رہے ہیں کہ ''تو کتنا پاکیزہ ہے، اور تیری ہوا کتنی پاکیزہ! تو کتنا عظیم ہے، اور تیری حرمت کتنی عظیم! (مگر) میں اس ذات کی قسم کھاتا ہوں، جس کے ہاتھ میں محمد (ﷺ) کی جان ہے! ایک مومن کی حرمت اللہ تعالیٰ کے نزدیک یقیناً تیری حرمت سے بھی زیادہ عظیم ہے، اس کا مال بھی اور اس کا خون بھی''۔

(سنن ابن ماجہ: ص ۲۸۲ ابواب الفتن)

اللہ اکبر! اس روایت کے مطابق آنحضرت ﷺ نے اپنے پروردگار کی قسم کھا کر بتایا کہ ایک مومن کی جان و مال کی حرمت اللہ تعالیٰ کے نزدیک بیت اللہ شریف کی حرمت سے بھی زیادہ ہے۔

(ذکر و فکر ص ۲۲٦ از: مولانا محمد تقی عثمانی)

اگر اس پیغمبر رحمت کی امت بھی مسلمانوں کے، بلکہ انسانوں کے خون کی اہمیت و حرمت نہ سمجھ سکے اور اس کے ہاتھ بھی ایک دوسرے کے خون سے رنگین ہوں اور 'قتل غیرت' کے نام پر اس فعل کو حلال سمجھیں تو اس سے بڑھ کر بھی قابل افسوس، لائق حیرت اور تعجب انگیز کوئی بات ہوگی؟؟

جان کی قیمت:

مولانا محمد تقی عثمانی تحریر فرماتے ہیں:

جان بچانے کے لیے اسلام نے بڑے سے بڑے گناہ کے ارتکاب کی اجازت دی ہے، اگر جان جانے کا قوی اندیشہ ہو تو شراب اور خنزیر جیسی ناپاک اور حرام چیزوں کا استعمال بھی جان بچانے کی حد تک جائز ہے، بلکہ اگر کوئی شخص کنپٹی پر پستول رکھ کر یہ کہے کہ شراب پیو ورنہ تمھیں قتل کر دوں گا، تو

ایسی حالت میں جان بچانے کی خاطر شراب پینا صرف جائز ہی نہیں؛ واجب ہے، بلکہ اگر کوئی شخص مہلک ہتھیار سے مار ڈالنے کی دھمکی دے کر کلمۂ کفر کہلوانا چاہے تو ایسی حالت میں زبان سے کفر تک کا کلمہ کہنے کی شریعت نے اجازت دی ہے (بشرطیکہ دل میں ایمان صحیح سالم ہو)۔غرض بد سے بدتر گناہ بھی ایسی مجبوری میں جائز ہوجاتا ہے، لیکن ایک گناہ ایسا ہے جسے شریعت نے ایسی مجبوری کی حالت میں بھی جائز قرار نہیں دیا، اور وہ ہے قتل ناحق کا گناہ، یعنی اگر کوئی شخص دوسرے پر پستول تان کر اسے کسی تیسرے شخص کو قتل کرنے پر مجبور کرے، اور یہ کہے کہ تم فلاں شخص کو قتل کردو ورنہ میں تمھیں قتل کردوں گا، تو اس مجبوری کی حالت میں بھی اس کے لیے تیسرے شخص کا قتل کرنا جائز نہیں ہوگا۔ گویا حکم یہ ہے کہ ایسی صورت میں اپنی جان دینی پڑے تو دے دو، لیکن کسی بے گناہ کی جان نہ لو، یعنی جس انتہائی حالت میں شراب پینا جائز، خنزیر کھانا جائز، یہاں تک کہ کلمۂ کفر کہنا بھی جائز ہوجاتا ہے، قتل ناحق کا گناہ اس حالت میں بھی جائز نہیں ہوتا اور بقول جگر مرحوم ؎

اس نفع وضرر کی دنیا میں یہ ہم نے لیا ہے درس جنوں
اپنا تو زیاں تسلیم مگر اوروں کا زیاں منظور نہیں

انسانی عظمت:

جسم انسانی کس قدر محترم ومکرم ہے کہ حالت اضطرار میں جب کہ خنزیر اور شراب کھا اور پی کر بھی جان بچانے کی شریعت نے اجازت دی ہے، اس حال میں اگر کوئی شخص دوسرے کو اپنے بدن کا گوشت کھانے کی اجازت بھی دے دے، تب بھی دوسرے کے لیے اس کا کھانا حلال نہیں، جان کا تلف اور قتل کرنا تو دور کی بات ہے:

وان قال له آخر: اقطع يدى وكلها، لا يحل؛ لان لحم الانسان لا يباح فى الاضطرار لكرامته.

(ردالمحتار (شامی): ۹/۴۸۸، **کتاب الحظر والإباحة**، ط: زکریا دیوبند)

اگر بھوک سے مضطر شخص سے کسی دوسرے نے کہا کہ میرا ہاتھ کاٹ لو اور اس کو کھا جاؤ تو اس کے لیے اس کا کھانا حلال نہیں، اس لیے کہ انسان کا گوشت اس کی کرامت اور شرافت کی وجہ سے اضطراری حالت میں بھی جائز نہیں ہے۔

قتل غیرت کی وجہ:

مفتی صاحب نے اپنے مضمون میں 'قتل غیرت' کی دو وجہوں کی طرف اشارہ کیا ہے:

۱:-لڑکیوں کی بے راہ روی جس کی وجہ سے قندیل بلوچ کے بھائیوں نے اس کو قتل کر دیا۔

۲:- غیر کفو اور غیر برادری کے مرد سے عشق و محبت مفتی صاحب تحریر فرماتے ہیں: ''غیرت کے نام پر قتل یا تشدد کے واقعات ہندوستان میں بھی وقوع پذیر ہوئے ہیں، پاکستان میں اس کا تناسب بہت ہے، بی-بی-سی- کی رپورٹ کے مطابق ہر سال بیس ہزار افراد غیرت کے نام پر قتل کردیے جاتے ہیں۔ اس میں زیادہ تر خواتین ہوتی ہیں مگر مردوں کے قتل سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا۔ ابھی چند روز قبل کا واقعہ ہے کہ نومی ممبئ میں اونچی ذات کی لڑکی سے محبت کرنے کی پاداش میں سولہ سال کے دلت نوجوان کو قتل کر دیا گیا''۔

گرچہ یہاں مفتی صاحب نے غیر مسلم لڑکے اور لڑکی کا ذکر کیا ہے، لیکن بالکل یہی حال آج کل مسلم معاشرے کا بھی ہے، مسلمانوں میں خود ساختہ برادریوں کا جو نظام ہے ان میں اونچ نیچ اعلیٰ وادنیٰ اور شریف ورزیل کی ذہنیت پائی جاتی ہے۔ مغربی یو۔ پی۔ ہریانہ اور اس کے علاوہ میں بھی قتل کے بہت سے واقعات ہو چکے ہیں جس کی وجہ غیر برادری اور غیر کفو کے مرد سے محبت اور پھر شادی ہے۔

بلند شہر کے اڑولی گاؤں کے عبد الحکیم اور مہوش نے اپنی مرضی سے ۱۲/نومبر ۲۰۱۰ء کو میرٹھ میں شادی کرلی، دو مہینہ میرٹھ میں رہنے کے بعد مہوش اور عبد الحکیم جان کے خوف سے دہلی چلے گئے، دہلی میں جولائی ۲۰۱۱ء کو ان کے یہاں لڑکی پیدا ہوئی، دوسرے بچے کی ولادت کے لیے ۱۴/اگست ۲۰۱۲ء مہوش کو عبد الحکیم گاؤں لے آئے، مہوش کا بیان ہے کہ گاؤں لوٹنے کے بعد ان کا رہنا مشکل ہوگیا، میرے شوہر کو یقین تھا کہ گاؤں کے لوگ دو سال گزرنے کے بعد اب ہماری شادی کو تسلیم کرلیں گے، لیکن ایسا نہیں ہوا۔ مہوش کے میکے والے اور برادری کے لوگ عبد الحکیم کے دوسری برادری کا ہونے کی وجہ سے خوش نہیں تھے، چنانچہ ۲۲/نومبر ۲۰۱۲ء کو عبد الحکیم جب گاؤں کے ایک مطب سے دوا لے کر لوٹ رہے تھے راستہ میں مہوش کے رشتہ داروں نے انہیں گولی مار کر قتل کر دیا، بلند شہر میں آنر کلنگ کے تحت عبد الحکیم کا قتل پہلا معاملہ نہیں ہے، اس سے قبل نصف درجن سے زائد ناموس کی خاطر قتل کیے جا چکے ہیں۔ (سہارا، گورکھپور ۲۹/نومبر ۲۰۱۲ء ص ۹)

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ بہت پہلے اسی جاہلی عصبیت اور غیر اسلامی حمیت پر سوالیہ نشان لگا گئے ہیں ؎

یوں تو سید بھی ہو مرزا بھی ہو افغان بھی ہو　　　تم سبھی کچھ ہو بتاؤ کہ مسلمان بھی ہو!

نام نہاد مسلمانوں کی شقاوت قلبی کا ایک اور واقعہ جو کھالا پار (ضلع مظفر نگر) میں وقوع پذیر ہوا درج ذیل ہے:

شہر مظفر نگر: کھالا پار، میں ایک انتہائی دردناک اور رونگٹے کھڑا کردینے والا واقعہ رونما ہوا۔ اس محلّہ کی ایک لڑکی اور اسی شہر کے دوسرے محلّہ کا ایک لڑکا ایک ساتھ .M.B.B.S کر رہے تھے، دونوں کی برادریاں الگ تھیں، وقت گذرنے کے ساتھ دونوں نے شادی کا فیصلہ کرلیا۔ لڑکے کے گھر والوں کو اس شادی پر کوئی اعتراض نہیں تھا، لیکن لڑکی والے راضی نہیں تھے کہ غیر کفو (غیر برادری) میں شادی سے ان کے (غیر اسلامی) انا کو ٹھیس پہنچے گی، جب کسی صورت میں وہ لوگ تیار نہ ہوئے تو دونوں نے کورٹ میں شادی کرلی اور پھر نکاح پڑھوالیا، ادھر لڑکی والوں کا غصہ آسمان سے باتیں کررہا تھا، مزید برآں یہ کہ علماء حضرات غیر کفو کا حوالہ دے کر آگ پر پٹرول ڈالنے کا کام کر رہے تھے، چنانچہ لڑکی کے والد اور بھائیوں نے ان دونوں کو قتل کرنے کا فیصلہ کیا اور پولیس کارروائی سے بچنے کے لیے پہلے ہی پولیس کو لاکھوں روپے کی رشوت دے دی، ایک دن باپ نے لڑکی سے فون پر کہا کہ اب تم اور داماد صاحب گھر آیا جایا کرو، جو ہونا تھا ہوگیا، اب کوئی بات نہیں، دونوں ان کی بات پر اعتماد کرکے گھر آگئے، جیسے ہی آئے ان کو پکڑ کر باندھ دیا، اور ان کو بیچ چوک پر لائے اور انھیں چھرے سے قتل کرکے ان کی بوٹی بوٹی کرکے آگ میں جلا دیا۔ سیکڑوں لوگ دیکھتے رہے لیکن ڈر سے کسی نے کچھ نہیں کہا حتی کہ پولیس میں گواہی کے لیے بھی کوئی تیار نہیں ہوا کہ یہاں پر اس طرح کا دردناک واقعہ رونما ہوا۔

(ذات پات اور مسلمان ص ۴۲۵)

قاتل اور غیر کفو کا حوالہ دینے والے کیا یہ بھول گئے کہ دنیا کی عدالت کے بعد بھی ایک عدالت ہے۔

وہ دنیا تھی جہاں تم روک لیتے تھے زباں میری　　　یہ محشر ہے یہاں سننی پڑے گی داستاں میری

پنڈت آنند نرائن ملاؔ

"قتل غیرت" عہد جاہلیت کی "باقیات سیئات":

عہد جاہلیت میں غیر کفو میں نکاح کی ڈر سے لڑکیوں کو زندہ دفن کردیا جاتا تھا۔ ام یدسہ فی التراب (النحل:۵۹) یا اس کو زندہ یا مار کر مٹی میں گاڑ دے) اس آیت کے تحت امام قرطبی تحریر فرماتے ہیں:

قال قتادة: کان مضر و خزاعة یدفنون البنات احیاء، واشدھم فی ھذا تمیم زعموا خوف القھر علیھم وطمع غیر الاکفاء فیھن (قرطبی: ج۱۰،ص۱۱۴،م-بیروت لبنان)

حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ قبیلہ مضر وخزاعہ کے لوگ اپنی بیٹیوں کو زندہ دفن کر دیتے تھے، ان کا خیال تھا کہ ہم (لڑکیوں کی وجہ سے) مغلوب ہو جائیں گے اور غیر کفو کے لوگ ان سے شادی کی طمع، (خواہش) کریں گے۔

آج بھی قتل غیرت کے نام پر یہی کام ہو رہا ہے، اگر کسی لڑکے کا خود ساختہ اونچی ذات کی لڑکی سے تعشق ہو گیا اور انھوں نے شریعت کے مطابق نکاح بھی کر لیا، تب بھی کبھی لڑکے کو کبھی لڑکی کو اور کبھی دونوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے۔

تعشق کی صورت میں مرد اور عورت کا نکاح کر دیا جائے:

حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

اگر اتفاقاً کسی غیر منکوحہ اور کسی مرد میں باہم تعشق ہو جائے تو بہتر ہے کہ ان کا نکاح کر دیا جائے۔ (تعلیم الدین ص۴۳)

حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے 'قتل غیرت' سے بچنے کا بہترین حل پیش فرما دیا ہے، اب امت مسلمہ کو صرف عمل کی ضرورت ہے، ہم نوا حضرات کو حکیم الامت قدس سرہ کے ارشاد گرامی کو بار بار پڑھنے کی ضرورت ہے تاکہ حدود شریعت کا پاس ولحاظ رہے۔ عشق ضروری نہیں کہ ایک ہی برادری اور ہم کفو مرد وعورت کے درمیان ہو، کسی بھی برادری کے مرد اور عورت ہو سکتے ہیں۔ اپنی سفلی جذبات کی تسکین کی خاطر کسی مسلمان مرد یا عورت کا خون بہانا اور گناہ کبیرہ کا مرتکب ہونا شریعت کی سراسر خلاف ورزی ہے۔

دینی مصلحت کے پیش نظر غیر کفو میں نکاح کرنا افضل ہے:

مفتی اعظم پاکستان مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

نکاح کفاءت ومماثلت کی رعایت دین میں مطلوب ہے تاکہ زوجین میں موافقت رہے، لیکن کوئی دوسری اہم مصلحت اس کفاءت سے بڑھ کر سامنے آ جائے تو عورت اور اس کے اولیاء کو اپنا حق چھوڑ کر غیر کفو میں نکاح کر لینا بھی جائز ہے، خصوصاً جب کوئی دینی مصلحت پیش نظر ہو تو ایسا کرنا

افضل و بہتر ہے جیسا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے متعدد واقعات سے ثابت ہے۔

(معارف القرآن جلد ۸، ص ۱۵۳)

"قتل غیرت" نسبی عصبیت کی وجہ سے ہو رہا ہے، غیر مسلموں کی طرح مسلمانوں میں بھی برادری واد ہے اور اس کی وجہ سے آپس میں منافرت بھی کم نہیں، اس کی وجہ سے اسلامی وحدت کا تصور ہی مفقود ہے، اگر امت مسلمہ کے لوگ حضرت مفتی اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے اس مشورہ پر عمل پیرا ہو جائیں اور عورت کے اولیاء تعشق کی صورت میں غیر کفو میں نکاح پر راضی ہو جائیں، تو ایک مسلمان کا خون بھی محفوظ ہو جائے گا، برادری واد کی جڑیں کمزور ہو جائیں گی اور معاشرے میں اتحاد و اتفاق اور محبت پروان چڑھے گی اور جن لڑکیوں کو کفو میں رشتے نہیں مل رہے ہیں ان کا نکاح ہو جائے گا، اس سے بڑی دینی مصلحت اور کیا ہو سکتی ہے؟

ایک باپ کی "غیرت مذمومہ":

مولانا محمد تقی عثمانی تحریر فرماتے ہیں:

ابھی ایک خاتون نے امریکہ سے مجھے ایک طول طویل خط میں اپنی درد بھری داستان لکھی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ان کے والد ایک کروڑ پتی آدمی ہیں پڑھے لکھے ہیں، لیکن ان کو یہ اصرار تھا کہ وہ اپنی بیٹی کی شادی اپنی برادری سے باہر نہیں کریں گے، خاتون نے لکھا ہے کہ میں ان کی بڑی بیٹی ہوں، اور شروع میں مجھ سے شادی کرنے کے لیے کئی رشتے آئے، لیکن میرے والد نے ہر رشتہ یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ یہ برادری سے باہر کا رشتہ ہے، اس لیے ان کے لیے قابل قبول نہیں، یہاں تک کہ میری عمر زیادہ ہوتی چلی گئی، اور بالآخر رشتے آنے بند ہو گئے، یہاں تک کہ ایک روز میرے والد نے مجھ سے یہ کہا کہ اب میرے لیے تمھارا رشتہ اپنی برادری سے حاصل کرنا ممکن نہیں رہا، لہٰذا اب تم میرے سامنے یہ حلف اٹھاؤ کہ عمر بھر شادی نہیں کروں گی، میں چونکہ مالدار آدمی ہوں، لہٰذا جیتے جی تمھاری کفالت کروں گا، لیکن مجھے یہ کسی قیمت پر گوارا نہیں ہے کہ تمھاری شادی برادری سے باہر ہو، خاتون کہتی ہیں کہ والد صاحب نے مجھے یہ اقرار کرنے پر اتنا مجبور کیا کہ بالآخر میں نے یہ وعدہ کر لیا کہ تمام عمر شادی نہیں کروں گی۔ (ذکر و فکر ص ۳۱۶-۳۱۵ عنوان: نکاح اور برادری)

اس واقعہ کے بعد مولانا محمد تقی عثمانی تحریر فرماتے ہیں:

یہ واقعہ تو انتہائی سنگین نوعیت کا ہے، لیکن یہ بات اکثر دیکھنے، سننے میں آتی رہتی ہے کہ لوگ برادری میں نکاح کرنے کے بارے میں طرح طرح کی غلط فہمیوں کا شکار ہیں۔

کفو میں رشتہ نہ ملنے کی صورت میں غیر کفو میں شادی کرنے میں کوئی حرج نہیں:

مولانا محمد تقی عثمانی تحریر فرماتے ہیں:

بعض احادیث وروایات میں یہ ترغیب ضرور دی گئی ہے کہ نکاح کفو میں کرنے کی کوشش کی جائے، تاکہ دونوں خاندانوں کے مزاج آپس میں میل کھاسکیں، لیکن یہ سمجھنا غلط ہے کہ کفو سے باہر نکاح کرنا شرعاً بالکل ناجائز ہے، یا یہ کہ کفو سے باہر نکاح شرعاً درست نہیں ہوتا، حقیقت یہ ہے کہ اگر لڑکی اور اس کے اولیاء کفو کے باہر نکاح کرنے پر راضی ہوں، تو کفو سے باہر کیا ہوا نکاح بھی شرعاً منعقد ہوجاتا ہے، اور اس میں نہ کوئی گناہ ہے، نہ کوئی ناجائز بات، لہٰذا اگر کسی لڑکی کا رشتہ کفو میں میسر نہ آرہا ہو، اور کفو سے باہر کوئی مناسب رشتہ مل جائے تو وہاں شادی کردینے میں کوئی حرج نہیں ہے، کفو میں رشتہ نہ ملنے کی وجہ سے لڑکی کو عمر بھر بغیر شادی کے بٹھائے رکھنا کسی طرح جائز نہیں۔

برادری کی شرط پر زور دینا بے بنیاد اور لغو حرکت ہے:

مولانا محمد تقی عثمانی تحریر فرماتے ہیں:

شریعت نے یہ ہدایت ضرور دی ہے کہ لڑکی کو نکاح، بغیر ولی کے نہیں کرنا چاہئے (خاص طور سے اگر کفو سے باہر کرنا ہو تو ایسا نکاح اکثر فقہاء کے نزدیک بغیر ولی کے درست نہیں ہوتا) لیکن ولی کو بھی چاہئے کہ وہ کفو کی شرط پر اتنا زور نہ دے جس کے نتیجے میں لڑکی عمر بھر شادی سے محروم ہوجائے، اور برادری کی شرط پر اتنا زور دینا تو اور بھی زیادہ بے بنیاد اور لغو حرکت ہے جس کا کوئی جواز نہیں۔ ایک حدیث میں حضور سرورِ کونین ﷺ کا ارشاد ہے:

"اذا جاء کم من ترضون دینه وخلقه فزوجوه الا تفعلوا تکن فتنة في الارض وفساد کبیر".

جب تمھارے پاس کوئی ایسا شخص رشتہ لے کر آئے جس کی دینداری اور اخلاق تمھیں پسند ہوں تو اس سے (اپنی لڑکی) کا نکاح کردو۔ اگر تم ایسا نہیں کروگے تو زمین میں بڑا فتنہ وفساد برپا ہوگا۔

(ذکر وفکر ص ۳۱۸-۳۱۷، عنوان: نکاح اور برادری)

خیر القرون کے دو نکاح:

(۱) ایک مرتبہ ایک نوجوان صحابی رضی اللہ عنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور کہا: اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں نکاح کرنا چاہتا ہوں، لیکن کہیں پیغام بھیجتا ہوں تو لوگ مجھے لڑکی دینے سے انکار کر دیتے ہیں، وہ صحابی رضی اللہ عنہ حجامت (پچھنے لگانے) کا کام کرتے تھے، چونکہ وہ معمولی پیشہ کرتے تھے اور غلام تھے اس لیے لوگ انھیں اپنی بیٹی دینے کے لیے راضی نہ تھے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اس جوان سے فرمایا کہ تم فلاں قبیلہ میں چلے جاؤ اور میری طرف سے اس قبیلہ کے سردار سے کہو کہ وہ کسی سے تمھارا نکاح کرادے۔ (ابوداؤد) اس طرح اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا نکاح عرب کے ایک شریف قبیلہ میں پڑھوا دیا۔

(۲) معجم طبرانی میں روایت ہے کہ اشعث رضی اللہ عنہ بن قیس (وفات نبوی کے بعد دین سے منحرف ہوگئے تھے) حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں جب وہ گرفتار کر کے لائے گئے (اور تائب ہوکر دین کی طرف دوبارہ رجوع کیا) تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ان کے ہاتھ پیر کھلوائے پھر اپنی ہمشیرہ ام فروہ رضی اللہ عنہا سے ان کا نکاح کر دیا۔

(معجم کبیر طبرانی جلد اول ص ۲۰۸ بسند صحیح اور مجمع الزوائد ص ۲۱۵ ج ۹، اصابہ ج ۱، ص ۵۱)

اشعث کے دو لڑکے محمد اور اسحاق ام فروہ کے بطن سے پیدا ہوئے۔ (اصابہ ج ۱، ص ۵۱) اور دو لڑکیاں بھی پیدا ہوئی تھیں ان میں سے ایک کا نام حبابہ اور دوسری کا نام قریبہ تھا۔

(اصابہ ج ۴، ص ۴۸۳، استیعاب ج ۴، ص ۴۸۴)

اس نکاح کے متعلق محدث کبیر فقیہ جلیل مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

دیکھیے یہ وہی اشعث ہیں جن کو حضرت علی رضی اللہ عنہ حائک بن حائک کہا کرتے تھے، کپڑا بننے والے کا وہی لڑکا کسی معمولی عورت کا نہیں بلکہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی ہمشیرہ کا کفو قرار دیا جاتا ہے اور قرار دینے والا وہ ہے جو اسلام میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب سے اونچا مقام رکھتا ہے اور جس کی نسبت آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سارے مسلمانوں کو حکم دیا ہے "اقتدوا بالذين بعدي أبي بكر (رضى الله عنه) وعمر (رضى الله عنه)" (وہ دونوں جو میرے بعد ہیں یعنی ابوبکر رضی اللہ عنہ وعمر رضی اللہ عنہ ان کے قدم بقدم چلو)

(دست کار اہل شرف ص ۱۱۸)

اسلامی کتب خانے

(اٹھارہویں قسط)

از: دکتور علی بن علی ابو یوسف جہنی ترجمہ وتلخیص: مسعود احمد الاعظمی

مدارس کے کتب خانے اور لائبریریاں:

سطور ذیل میں ہم صرف مشہور اسلامی مدارس کے کتب خانوں کے ذکر پر اکتفا کریں گے، اوران کے تذکرے میں ان کے تاسیس وقیام کی ترتیب زمانی کو ملحوظ رکھیں گے۔

۱- مدرسۂ ابوحنیفہ- رحمہ اللہ- کا کتب خانہ:- یہ مدرسہ ۴۵۹ھ میں قائم ہوا، اور اس پر بڑی تعداد میں کتابیں وقف کی گئیں، کتب خانے میں جاحظ کی بیشتر تصانیف تھیں، اس پر ابن جزلہ نے بھی اپنی کتابیں وقف کردی تھیں(۱)۔

۲- مدرسۂ نظامیہ کا کتب خانہ:- جس کو ابوعلی حسن بن علی بن اسحاق نظام الملک طوسی (مولود ۴۰۸ھ = ۱۰۱۸ء) نے قائم کیا تھا، نظام الملک طوسی سلطان الپ ارسلان اوراس کے فرزند ملک شاہ سلجوقی کا وزیر تھا، اوراپنی سرگرمی، ذکاوت اورعلم دوستی ومعارف پروری میں شہرۂ آفاق تھا، ۴۸۵ھ=۱۰۹۲ء میں اس کو قتل کرکے جاں بحق کردیا گیا۔

نظام الملک نے اس مدرسے کو بغداد میں تعمیر کیا تھا، ۴۵۷ھ=۱۰۶۴ء میں اس نے اس کی تعمیر کا آغاز کیا، اوراس کی عمارت ۴۵۹ھ میں مکمل ہوکر افتتاح پذیر ہوئی۔

اس مدرسے میں نظام الملک نے ایک بڑا کتب خانہ بنوایا تھا، جو بہت ساری عمدہ اوربیش قیمت کتابوں اور قلمی نسخوں پر مشتمل تھا، چنانچہ مذکور ہے کہ عبدالسلام قزوینی نے نظام الملک کو ۴/ایسی چیزیں ہدیہ کی تھیں جو کسی کے پاس نہیں تھیں، منجملہ ان کے ابوعمر بن حیوۃ کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ابراہیم حربی کی غریب الحدیث دس جلدوں میں تھی، جس کو نظام الملک نے مدرسہ کے طلبہ کے لیے وقف

(۱) اس کی تفصیل کے لیے دیکھئے سبط ابن الجوزی کی مرآۃ الزمان: ۴۲۰/۸-۴۲۱

کر دیا[۱]۔

اس مدرسہ کے افتتاح کے صرف چند سال بعد ۴۶۲ھ میں ایک رئیس نے کتابوں کا ایک کلیکشن اس کو عطا کیا، جو اس کے کتب خانے میں ضم کر دیا گیا[۲]۔

۵۱۰ھ میں اس مدرسہ میں آگ لگ گئی، اور دیکھتے ہی دیکھتے اس مدرسہ کے طلبہ نے اس کی کتابیں (دوسری جگہ) منتقل کر دیں، اور اس طرح اس کی کتابوں کو بچا لیا، اور آگ کے شعلے کتب خانے کی عمارت کو نگل گئے، جس کی وجہ سے اس کو دوبارہ تعمیر کرنا پڑا۔

چونتیسویں عباسی خلیفہ ناصر الدین اللہ نے ۵۸۹ھ=۱۱۹۳ء میں کتب خانے کی عمارت کو از سر نو تعمیر کرایا، اور ہزاروں کی تعداد میں ایسی منتخب اور بیش قیمت کتابیں اس میں مہیا کیں، جن کی کوئی نظیر نہیں تھی۔

یہ مدرسہ اور اس کا کتب خانہ خلفاء، امراء، اور وزراء کا ہر دور میں مرکز نگاہ رہا، اور مختلف اسلامی شہروں سے طلبہ اس میں کھنچ کھنچ کر آتے رہے۔

ساتویں صدی ہجری کے اواخر تک اس میں لگا تار کتابیں وقف کی جاتی رہیں، چنانچہ بہت سے اہل علم نے اس پر کتابیں وقف کیں، اور اس کتب خانے کے جو لوگ نگراں اور ذمہ دار ہوئے ان کے واقعات سے تذکرے کی کتابیں بھری ہوئی ہیں، جن میں سے بعض کا ذکر ان شاء اللہ آگے آئے گا۔

اس کتب خانے کی کتابوں کی تعداد کتنی تھی، اس میں مؤرخین مختلف الرائے ہیں، ابن الجوزی متوفی ۵۹۷ھ - رحمۃ اللہ علیہ - نے لکھا ہے کہ اس نے مدرسہ نظامیہ پر وقف کتابوں کی ایک فہرست دیکھی تو اس میں چھ ہزار (۶۰۰۰) جلدیں درج تھیں۔

۳- مدرسہ بشیریہ کا کتب خانہ:- جس کی بنیاد مستعصم کی بیوی اور اس کے لڑکے محمد ابونصر کی ماں نے باپ بشیر پر رکھی تھی، اور اس کو مذاہب اربعہ کی تعلیم کے لیے وقف کیا تھا، ۶۵۴ھ= ۱۲۵۶ء میں اس مدرسے کا آغاز ہوا، اس خاتون نے اس مدرسہ پر ایک کتب خانہ بھی وقف کیا تھا، جس کی نگرانی فخر الدین ابراہیم بن حسن نامی ایک لائبریرین کے ذمہ تھی، جس کی ابن البواب کا تب

---

(۱) طبقات الشافعیہ: ۲۳۰/۳

(۲) المنتظم: ۶۵۶/۸

کے نام سے شہرت تھی، یہ شخص شاعر اور انشا پرداز تھا، خوشنویس بھی تھا اور اپنے خوش خط سے بہت سی کتابیں نقل کی تھیں، مدرسہ بشیریہ کے کتب خانے کی فہرست سازی کے لیے اس کو مقرر کیا گیا تھا، جس کو اس نے خوش اسلوبی سے انجام دیا، یہ ۷۱۴ھ =۱۳۱۴ء کا واقعہ ہے، اس کتب خانے کی کتابیں عاریت پر نہیں دی جاتی تھیں مگر اس شرط کے ساتھ کہ کتاب کی قیمت کے بقدر کوئی چیز رہن رکھی جائے۔

۴- مدرسہ مستنصریہ کا کتب خانہ: -بغداد کے مدرسہ نظامیہ کے بعد یہ مدرسہ اسلامی تہذیب وثقافت کا عظیم الشان مرکز اور بہت مشہور تھا، اس مدرسہ نے تعلیم کے میدان میں بہت بڑا کردار ادا کیا ہے، اس کی تعمیر کا سہرا عباسی خلیفہ مستنصر باللہ متوفی ۶۴۰ھ کے سر تھا۔ خلیفہ نے ایک ایسا مدرسہ قائم کرنے کا فرمان جاری کیا تھا، جس میں مذاہب اربعہ کی تعلیم دی جائے۔ اس کا نام مدرسہ مستنصریہ رکھا گیا، اس نے بغداد میں دریائے دجلہ کے مشرقی کنارے پر اس کی تعمیر شروع کی تھی، یہ اس کے سریر آرائے خلافت ہونے کے دوسال بعد ۶۲۵ھ کا واقعہ ہے، مگر اس کی تعمیر کا کام ۶ سال کے بعد ۶۳۱ھ =۱۲۳۳ء میں پورا ہوا۔

اس مدرسہ کی تعمیر میں بڑی دریا دلی کے ساتھ دولت صرف کی گئی تھی، چنانچہ مدرسہ اور اس کے کتب خانے کی عمارت نہایت عالیشان اور بے مثال تھی، اس کی تعمیر مکمل ہونے کے بعد خلیفہ نے اپنے وزراء، ارکان دولت اور بڑے بڑے عہدے داروں کے ساتھ جا کر شان وشوکت کے ساتھ اس کا افتتاح کیا۔

مؤرخین نے اس مدرسے اور اس کے کتب خانے کا جو نقشہ کھینچا ہے، اور اس کے اخراجات کو جس طرح بیان کیا ہے، اور اس کے ساتھ جس دلچسپی اور نگہداشت کا معاملہ کیا گیا ہے، اس سے یہ تاثر ملتا ہے کہ اس وقت تک اس سے خوبصورت اور اس سے زیادہ پُرشوکت عمارت تعمیر نہیں کی گئی تھی۔

حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ نے اس مدرسہ کو دیکھا تھا، اور ان کا یہ بیان ہے کہ ''دنیا میں اس جیسا کوئی مدرسہ نہیں ہے''(۱)۔

خلیفہ مستنصر باللہ علم دوست، علماء نواز، معارف پرور، کتابوں کا دلدادہ، اور مطالعہ کا شوقین

(۱) البداية والنهاية: ۱۳/ ۳۵

تھا[۱]۔ اس کے زمانۂ خلافت میں کتابوں کی قیمت بہت زیادہ بڑھ گئی تھی۔

مستنصر نے اس مدرسہ میں ایک بہت بڑا کتب خانہ بنوانے کے بعد، اس میں کتابوں کی فراہمی کے لیے زر کثیر صرف کیا، اس کے افتتاح کے دن قرآن کریم کے پاروں اور دینی وادبی علوم پر مشتمل نفیس اور عمدہ کتابیں اتنی بڑی تعداد میں منتقل کی گئی تھیں، کہ ان کو ایک سو ساٹھ (۱۶۰) بار برداروں نے اٹھایا تھا[۲]، وہ اس وقت کتب خانے میں داخل کی گئیں، بعد میں اس کے لیے جو کتابیں فراہم کی گئیں وہ اس کے علاوہ ہیں۔

ابن عنبہ نے لکھا ہے کہ یہ کتابیں اسی ہزار (۸۰۰۰۰) جلدوں میں تھیں، جن میں سے بیشتر مشہور خطاطوں کی اور خوبصورت ودلکش خط میں لکھی ہوئی تھیں[۳]۔

اس کتب خانے کی جس قدر تعریف وتوصیف کی گئی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتب خانہ بہت عظیم الشان اور پرشوکت تھا، چنانچہ علامہ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ ''اس پر کتابوں کا اتنا بڑا ذخیرہ وقف کیا گیا، کہ اتنی تعداد کا وقف کرنا سنا نہیں گیا، اور نہ ہی اتنے خوبصورت اور نفیس نسخے کہیں وقف کیے گئے''۔

اور ابن کثیر ہی نے اس کے متعلق ایک دوسری جگہ لکھا ہے:

''اس پر اتنی نفیس اور عمدہ کتابیں وقف کی گئیں، جن کی نظیر دنیا میں کہیں نہیں ہے''۔

اہل علم، ارباب درس وافادہ اور طلبا نے اس کتب خانے سے خوب فائدہ اٹھایا، کیونکہ اس وقت وہ اہل علم وعرفان کا مرجع تھا، اور تقریباً دوصدیوں تک مستنصریہ میں رہنے والے اور اس کے باہر کے تشنگان علم کی پیاس بجھاتا رہا، کیونکہ یہ مدرسہ اور اس کا کتب خانہ ساتویں اور آٹھویں صدی ہجری میں عالم اسلام کا عظیم ترین اور مشہور ترین ادارہ تھا، خاص طور سے اس دور میں جب کہ ابن الفوطی -رحمہ اللہ تعالیٰ- اس کے سرپرست اور ناظم کتب خانہ تھے۔

خلیفہ مستنصر نے اس مدرسہ کے دوام وبقا کے لیے بہت سے بڑے بڑے اور زرخیز اوقاف اس کی نذر کیے، اور ان اوقاف کا ایک بڑا حصہ کتب خانہ اور اس کے نگرانوں کے واسطے خاص کر دیا،

---

(۱)خلاصة الذهب المسبوك:۲۸۶ (۲)الحوادث الجامعة:۵۴
(۳)تلخيص مجمع الأدب، القسم الأول:۲۸/۴

اسی طرح اس نے کتب خانے کے لیے قلم، کاغذ، سیاہی اور دیگر آلات کتابت مفت فراہم کیے۔

اسلامی مدارس سے ملحق ان عظیم الشان کتب خانوں کے دوش بدوش کچھ دوسرے مدارس بھی تھے، جو عالم اسلام میں پھیلے ہوئے تھے، جن کے اپنے کتب خانے تھے، اگر چہ وہ مذکورہ بالا کتب خانوں کی طرح شہرت کے حامل نہیں تھے، ان میں اہم کتب خانے حسب ذیل ہیں:

۵- مدرسہ بیہقیہ کا کتب خانہ: - نیشاپور میں تھا، تقریباً چوتھی صدی ہجری میں قائم ہوا تھا، جب کہ ابھی نظام الملک پیدا بھی نہیں ہوا تھا، یہ حدیث وسنت -علی صاحبہا افضل الصلاۃ وازکی التسلیم - کی تعلیم کے لیے خاص تھا، اس مدرسہ پر ایک کتب خانہ بھی وقف کیا گیا تھا۔

۶- بغداد کے مدرسہ فخریہ کا کتب خانہ: - اس کتب خانے کو ادیب فخر الزماں ابوالفضل مسعود بن علی معروف بہ ''ابن الصوابی'' -متوفی ۵۷۸ھ=۱۱۸۲ء- نے بنایا تھا، اس کا لقب فخر الدولۃ ابوالمظفر ابن المطلب تھا۔ اس کے اندر ایک ایسا کتب خانہ بھی تھا، جس میں ہر علم وفن کی کتابیں دستیاب تھیں، اور اس کے لیے بہت سے اوقاف مخصوص کیے گئے تھے۔

۷- حلب کے مدرسۂ نوریہ کا کتب خانہ: - اس مدرسہ کو الملک العادل نور الدین محمد زنگی متوفی ۵۶۹ھ نے ۵۱۷ھ=۱۱۲۳ء میں قائم کیا تھا، اسی بادشاہ کے نام سے یہ موسوم ہوا، اور اس نے اپنی کتابوں کا ایک حصہ اس پر وقف کر دیا۔

حافظ ذہبی نے اس انصاف پرور بادشاہ کے حالات اور کارہائے نمایاں شمار کراتے ہوئے لکھا ہے کہ: ''اس نے بہت سی بیش قیمت کتابیں وقف کیں''(۱)۔

۸- قاہرہ کے مدرسۂ فاضلیہ کا کتب خانہ: - اس مدرسہ کو قاضی ابوعلی عبدالرحیم بن علی محمود لخمی بیسانی عسقلانی نے ۵۸۰ھ=۱۱۸۴ء میں اپنے گھر سے متصل بنایا تھا اور اس میں یتیموں کے واسطے ایک مکتب بھی قائم کیا تھا، اس نے اس پر ہر علم وفن سے متعلق بہت ساری کتابیں وقف کی تھیں، کہا جاتا ہے کہ وہ کتابیں ایک لاکھ سے زائد جلدوں پر مشتمل تھیں۔ قاضی فاضل نے ان کتابوں کی فراہمی میں بہت کافی دولت خرچ کی تھی، جو ہر فن میں تھیں، اور ہر جگہ سے ان کو حاصل کیا تھا(۲)۔

اس مدرسے کا کتب خانہ اسلامی تمدن کے عظیم الشان کتب خانوں میں سے ایک تھا، اور اسی کے ساتھ

(۱) سیر اعلام النبلاء: ۲/۵۳۲ (۲) خطط مقریزی: ۲/۳۶۶-۳۶۷

اسلامی مدارس کے خوبصورت ترین کتب خانوں میں شمار کیا جاتا تھا[1]۔

قاضی فاضل کی ولادت ۵۲۹ھ = ۱۱۳۵ء میں اور وفات ۵۹۶ھ = ۱۲۰۰ء میں ہوئی تھی۔

۹- دمشق کے دارالحدیث الاشرفیہ کا کتب خانہ: - اس کو الملک الاشرف موسیٰ ابن ابی بکر بن ایوب - متوفی ۶۳۵ھ = ۱۲۳۷ء - نے دمشق کا ایک گھر خرید کر قائم کیا تھا، پھر اس کو وقف کر دیا، اور "اس میں بہت سی کتابیں منتقل کیں، جو نہایت عمدہ تھیں"۔ یہ کتب خانہ علامہ ابن الصلاح تقی الدین عثمان بن عبدالرحمٰن کردی - متوفی ۶۴۳ھ = ۱۲۴۵ء - جیسے محدثین کا مرکز توجہ رہا، ابن الصلاح وہ عالم تھے، جنھوں نے تحصیل علم کے لیے دور دراز کا سفر کیا، اور بہت سے علماء و مشائخ حدیث کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا، علم وفن کی بے پناہ کتابوں کا مطالعہ اور ان سے استفادہ کیا، انھوں نے بہت بڑی تعداد میں دارالحدیث الاشرفیہ میں کتابیں وقف کیں۔

۱۰- قاہرہ کے مدرسہ ظاہریہ کا کتب خانہ: - اس مدرسے کو الملک الظاہر بیبرس نے قاہرہ میں قائم کیا تھا، اس کی تعمیر ۶۶۲ھ = ۱۲۶۳ء میں مکمل ہوئی، اور بانی ہی کے نام پر اس مدرسے کا نام بھی رکھا گیا۔

اس نے اس میں چار ایوان تعمیر کیے، دو حنفی اور شافعی مذہب کی تعلیم کے لیے، اور دو علم حدیث اور قرأت سبعہ کے لیے، اس کے اندر ایک کتب خانہ بھی تعمیر کیا جو تمام علوم کی امہات الکتب پر مشتمل تھا، یہ مدرسہ قاہرہ کے خوبصورت ترین مدارس میں شمار کیا جاتا تھا۔

۱۱- قاہرہ کے مدرسہ منصوریہ کا کتب خانہ: - اس کو شاہ منصور بن قلاوون صالحی - متوفی ۶۸۹ھ = ۱۲۹۰ء - نے ۶۸۳ھ میں قائم کیا تھا، اس مدرسے میں ائمۂ اربعہ کے مذاہب کے مطابق تعلیم دی جاتی تھی، نیز طب اور دیگر فنون کی تعلیم کا بھی نظم تھا۔

اس نے اس مدرسے پر ایک عظیم الشان کتب خانہ وقف کر رکھا تھا جس میں نہایت نفیس اور عمدہ کتابیں بہم پہنچائی گئی تھیں، اور ہر فن کی کتابوں کا ذخیرہ جمع ہو گیا تھا۔

۱۲- قاہرہ کے مدرسہ ناصریہ کا کتب خانہ: - اس کی تعمیر الملک الناصر محمد بن قلاوون نے ۷۰۳ھ = ۱۳۰۳ء میں مکمل کی تھی، اس نے بھی ائمۂ اربعہ کے مذاہب کی تعلیم کے لیے ۴ر

---

(۱) دور الکتب العربیة العامة وشبه العامة: ۱۸۰

ایوان تعمیر کرائے تھے، اور اس کے لیے بہت سارے اوقاف مخصوص کیے تھے، اور ایک بہت بڑا کتب خانہ اس میں بنایا تھا[1]۔

مذکورہ بالا مدارس کے علاوہ بھی دسیوں مدرسے تھے، جن کے اپنے کتب خانے تھے، اور وہ بیشتر علوم وفنون کی کتابوں سے معمور تھے، ان میں سے بعض تو ماضی قریب تک محفوظ تھے۔

مذکورہ بالا معروضات سے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہوجاتی ہے کہ اسلامی تہذیب وثقافت کس قدر ترقی اور عروج تک پہنچ چکی تھی۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی مدارس کے کتب خانے اس تہذیبی ترقی کے شانہ بشانہ تھے، اور ان کتب خانوں میں علم وفن اور ادب وثقافت کی جو کتابیں محفوظ تھیں انھوں نے اس تہذیب کے فروغ میں کتنا اہم کردار ادا کیا تھا۔

ہمارے معروضات سے یہ بھی سمجھا جاسکتا ہے کہ ان کتابوں اور عمدہ نسخوں کے کتب خانے کے اندر وباہر نکالنے اور لے جانے کا بھی انتظام تھا، جس نے اہم کتابوں اور نادر نسخوں کی نقل کی سہولت فراہم کی۔

نیز ان کتب خانوں سے استفادہ کرنے والے علماء وطلبہ کے لیے علم وتحقیق کے لوازم مثلاً کاغذ، قلم اور سیاہی وغیرہ مفت فراہم کیے جاتے تھے۔

اور یہ بات بھی ظاہر ہوجاتی ہے کہ ہر دور اور ہر عہد میں ان مدارس کے کتب خانوں پر کس قدر نگاہ التفات اور نظر کرم کی گئی اور خلفاء، حکام، امراء اور علماء سب نے کس قدر دلچسپی کا مظاہرہ کیا، یہاں تک کہ عام افراد بھی پیچھے نہیں رہے، اور ہر مدرسے میں ایک کتب خانہ خاص کرنے کا جذبہ کارفرما رہا۔

ان مدارس کے اولین بانیوں نے -اللہ تعالیٰ ان کے اوپر رحمت نازل فرمائے- یہ محسوس کیا کہ تعلیمی سرگرمی کے لیے کتاب ایک ضروری چیز ہے، استاذ ہو یا طالب علم کوئی اس سے بے نیاز نہیں ہوسکتا، اور یہ کہ کتب خانہ تربیت وکردارسازی کے لیے ایک ایسے ستون کی طرح ہے، جس سے نہ تغافل کیا جاسکتا ہے اور نہ اس کی اہمیت کا انکار کیا جاسکتا ہے، کیونکہ وہ اس وقت سے -اب تک- تعلیمی

(۱) خطط مقریزی: ۲۲۲/۲

نظریے کی تقویت میں بہت بڑا حصہ دار رہا ہے۔ اس کا نتیجہ تھا کہ مدارس کے قیام کے ساتھ ساتھ بڑی تعداد میں کتابوں اور تصانیف کی فراہمی کا بھی اہتمام ہوتا رہا۔

ان مدارس کے کتب خانوں کا بیشتر کلیکشن بہت بڑا اور عظیم ہوتا، جس کی وجہ سے وہ زندہ جاوید اور شہرۂ آفاق ہوگئے، جب کہ ان کے علاوہ کچھ کم کتابوں والے کتب خانے بھی تھے، جس کے سبب وہ زیادہ شہرت نہیں حاصل کر سکے۔

اس سے یہ مطلب بھی نکالا جا سکتا ہے کہ مدرسہ کی شہرت و ناموری اس کے کتب خانے کی مرہون منت ہوتی تھی، اور یہی وہ چیز ہے جس نے نظامیہ، مستنصریہ اور فاضلیہ جیسے عظیم الشان مدارس کو غیر معمولی شہرت بخشی۔

مدارس اسلامیہ کے واسطے سے علم و معرفت کی اشاعت:

بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کچھ خاص عوامل تھے جنھوں نے اسلامی مدارس اور ان کے کتب خانوں کی علم و معرفت اور تہذیب و ثقافت کے پیغام کو پھیلانے میں مدد کی، اور اس طرح اسلام اور مسلمانوں کی بہترین طور پر خدمت کے قابل بنایا، حتی کہ ان مدارس اور کتب خانوں کو وسیع پیمانے پر سیادت و بالادستی اور بے پناہ شہرت حاصل ہوئی، بعض محرکات حسب ذیل ہیں:

۱- مسلمان حکام و امراء وغیرہ ان مدارس کے لیے مستقل آمدنی اور وظیفوں کا انتظام کرتے تھے۔ مدارس، ان کے طلبہ اور اساتذہ کے لیے جائدادیں وقف کیا کرتے تھے، جو ان کے اخراجات کا ایک طویل مدتی انتظام تھا۔

۲- ورّاقوں (نسخہ نویسوں) نے علم و معرفت کی نشر و اشاعت میں نہایت اہم کردار ادا کیا، یہ لوگ اپنے اور دوسروں کے واسطے کتابوں کے نسخے لکھا کرتے تھے، اور بعض بعض اہل علم کے اپنے مخصوص نسخہ نویس ہوا کرتے تھے۔

۳- اسلامی شریعت کی خدمت اور علم کی اشاعت میں طلبہ کا بھی اہم کردار رہا ہے، کیونکہ وہ مدارس میں داخل ہو کر بھرپور توجہ اور پوری یکسوئی کے ساتھ علم حاصل کرتے تھے، اور پھر اس روشنی کو پھیلانے میں مصروف ہو جاتے تھے۔

۴- علم و معرفت کے فروغ کا ایک اہم محرک اسلامی مدارس کی مفت تعلیم بھی تھی، چنانچہ

مدارس کے دروازے ہر آنے والے کے لیے کھلے رہتے تھے، جس کو بھی تحصیل علم کا شوق دامن گیر ہوتا، مدرسے کے دروازے کو کھلا ہوا پاتا- جہاں اس کو زندگی کے تمام وسائل مہیا ملتے- چنانچہ وہاں مفت تعلیم کے ساتھ ساتھ کھانا، کپڑا، رہائش، علاج، اور ذاتی اخراجات کا انتظام ہوتا۔

اسلامی مدارس کے یہ جو انتظامات تھے، ان کی وجہ سے اللہ کے فضل وکرم سے مسلمان طلبہ کو موسم گرما (کی تعطیل) میں ہوٹلوں اور ریستورانوں میں کام کرنے کے لیے مجبور نہیں ہونا پڑتا تھا، جیسا کہ آج امریکہ ویورپ کی یونیورسٹیوں میں بہت سے تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ کرتے ہیں، تاکہ ان یونیورسٹیوں کی تعلیم کے لیے اپنے خرچ اور اخراجات کا انتظام کر سکیں۔

۵- منجملہ ان محرکات کے یہ بھی ہے کہ مسلمان علماء ان مدارس میں آکر بہت بہت دنوں تک ان میں رہتے تھے، ان کا یہ قیام باہمی گفت وشنید اور وعظ وتذکیر، تصنیف وتالیف اور علم وفن کے مختلف شعبوں میں درس وتدریس اور املا کی مجلسوں کے انعقاد میں معاون ہوتا تھا۔

۶- اسلام کے اُس عہد زریں میں اسلامی مدارس ترقی اور عظمت وبلندی اور نظم ونسق کے جس مقام تک پہنچ چکے تھے، اس کے ثبوت کے لیے یہ دلیل کافی ہے کہ عصر حاضر کی یونیورسٹیوں کا بیشتر نظم ونسق بشمول اپنی نمایاں عمارتوں کے، ان کا تدریسی وتعلیمی نظام، یا تعلیم وتربیت کے ضوابط، یا طرز تدریس، یا یونیورسٹی کا رہائشی نظام، یا اساتذہ ومعلمین کی اچھی زندگی کے لیے ان کی تمام ضروریات زندگی کی تکمیل، ہماری اسلامی تہذیب مدارس کے اصول وضوابط اور ہماری اسلامی شریعت کے سرچشموں سے مستفاد ہے۔

خاتمہ:

اس بحث کے آخر میں اس بات کی طرف اشارہ کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے جو مسلمان علماء وامراء نے تیسری صدی ہجری (نویں صدی عیسوی) کے اواخر سے عالم اسلام کے مشرقی حصوں میں مساجد سے الگ ہٹ کر مدارس کے قیام کی طرف پیش رفت کی۔ یہ پیش رفت ان اہل علم اور کارپردازان حکومت کے اسلامی شریعت، عربی زبان کے علوم اور دیگر علم وفن کی تعلیم کی نشر واشاعت کی شدید ترین خواہش کا نتیجہ تھی۔

اور جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے ان لوگوں نے اسی وقت سے بقیہ صفحہ ۲۶ پر

وفیات

مسعود احمد الاعظمی

حضرت مولانا عبدالحق اعظمی صاحب

۳۰؍ربیع الاول ۱۴۳۸ھ مطابق ۳۱؍دسمبر ۲۰۱۶ء جمعہ کا دن گزرنے پر مغرب کی نماز کے بعد اور عشاء سے کچھ پہلے یہ جانکاہ خبر موصول ہوئی کہ از ہر ہند دارالعلوم دیوبند کے جلیل القدر اور عظیم المرتبت استاد ہندوستان کے مؤقر اور معمّر عالم اور ہزاروں تشنگان علم ومعرفت کے معلم ومربی حضرت مولانا عبدالحق صاحب اعظمی کا دیوبند میں مغرب وعشاء کے درمیان انتقال ہو گیا، إنا للّٰہ و إنا إلیہ راجعون.

مولانا کے انتقال کی خبر پھیلتے ہی نہ صرف ہندوستان کے طول وعرض میں پائے جانے والے مدارس بلکہ عام علمی ودینی حلقوں میں رنج وغم کی لہر دوڑ گئی، اہل علم کو اپنی صفوں میں ایک بڑا نقصان اور تشویشناک خلا محسوس ہونے لگا، اور طالبان علم نبوت اپنے آپ کو ایک شفیق اور مہربان معلم ومربی کے فیوض وبرکات سے محروم محسوس کرنے لگے، ایک ایسی شخصیت کا غم رحلت جس نے اپنی عمر عزیز کا ایک ایک لمحہ درس وتدریس، تعلیم وتربیت، وعظ وتذکیر اور علم وفن کی نشر واشاعت میں بسر کر دیا اور علم دین کی خدمت کرتے کرتے اور قال اللہ وقال الرسول کا ترانہ بلند کرتے کرتے جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔

انتقال کے وقت مولانا کی عمر ۹۰ سال سے متجاوز تھی، وہ ۱۶؍رجب ۱۳۴۵ھ کو ضلع اعظم گڑھ کے ایک مقام جگدیش پور میں پیدا ہوئے، ان کے والد کا نام محمد عمر تھا، لیکن ابھی مولانا کی عمر ۶؍سال کی تھی کہ والد کی وفات ہو گئی۔ والد کے انتقال کے بعد ان کی کفالت اور تعلیم وتربیت جون پور کے ایک عظیم المرتبت عالم مولانا محمد مسلم نے کی، مولانا محمد مسلم علیہ الرحمۃ نے تعلیم وتربیت، پرورش وپرداخت اور نگہہ داشت کا حق ادا کر دیا۔ مولانا عبدالحق صاحب نے مختلف مدارس میں تعلیم حاصل کی، جن میں بیت العلوم سرائے میر، دارالعلوم مئو اور دارالعلوم دیوبند ممتاز ادارے ہیں۔ دارالعلوم

دیوبند میں شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی سے بخاری شریف مکمل اور ترمذی جلد اول، علامہ ابراہیم بلیاوی سے مسلم شریف، مولانا اعزاز علی سے سنن ابوداؤد، ترمذی جلد ثانی اور شمائل ترمذی، مولانا فخر الحسن مرادآبادی سے سنن نسائی، موطا امام مالک، شرح معانی الآثار، اور مولانا ظہور احمد دیوبندی سے سنن ابن ماجہ پڑھ کر ۱۳۶۸ھ میں فارغ التحصیل ہوئے۔ آپ کو حضرت مولانا مدنی کے علاوہ محدث کبیر حضرت علامہ اعظمی ؒ سے اوائل السنبلیہ کی، شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا کاندھلوی سے مسلسلات کی اجازت کے علاوہ حضرت مولانا شاہ عبدالغنی پھول پوری اور حضرت مولانا قاری محمد طیب سے بھی حدیث کی اجازت حاصل تھی۔

مولانا مرحوم نے فراغت کے بعد درس وتدریس کا سلسلہ شروع کیا تو زندگی بھر اس مبارک کام سے وابستہ رہے، اور مختلف مدارس میں تدریسی خدمات انجام دیں۔ انھوں نے اپنے تدریسی سفر کا آغاز مدرسہ مطلع العلوم بنارس سے کیا، لیکن ان کی تدریسی زندگی کا سب سے طویل سلسلہ دارالعلوم مئو اور دارالعلوم دیوبند سے وابستہ ہے، دارالعلوم مئو میں وہ منصب شیخ الحدیث کے ساتھ ساتھ مسند افتاء پر بھی متمکن رہے، اور فتوی نویسی کی خدمت انجام دیتے رہے۔ ۱۴۰۲ھ (غالباً ۱۹۸۲ء) میں دارالعلوم دیوبند کی مدرسی کے لیے ان کا انتخاب عمل میں آیا، جہاں بخاری شریف جلد ثانی پڑھانے کا قرعۂ فال ان کے نام نکلا، اور اس وقت سے تادم واپسیں تقریباً ۳۵ر سال ان کی صدائے قال اللہ وقال الرسول سے اس مرکز علمی کے در و دیوار گونجتے رہے، اور اس دوران بے شمار طالبان علوم نبوت آپ کے علم ومعرفت سے فیض یاب ہوئے۔

مولانا مرحوم ایک تجربہ کار اور کہنہ مشق مدرس، کامیاب معلم ومربی، باوقار شیخ الحدیث، اور باعزت عالم ہونے کے ساتھ ایک اچھے مقرر وواعظ، اور صاحب نسبت بزرگ تھے، درس ومطالعہ کے علاوہ اوراد و وظائف اور اذکار کا بھی مستقل معمول اور بڑا اہتمام تھا۔ تواضع، فروتنی اور خاکساری وسادگی ان کی شخصیت کے اہم اجزاء تھے۔ طلبہ وتلامذہ پر نہایت شفیق اور مہربان تھے، اگر اپنے کسی شاگرد پر سختی یا اس کو سرزنش بھی کرتے تو اس میں محبت وشفقت کا عنصر پنہاں ہوتا، مہمانوں کی ضیافت جی کھول کر کرتے، ان کے پرانے متعلقین اور شناساؤں میں کوئی ان سے ملنے جاتا تو اصرار کر کے

دعوت کرتے، اور جب دسترخوان لگتا تو اہتمام سے اور اصرار کر کے کھلاتے۔

احقر کو مولانا کے ساتھ ایک مرتبہ دیوبند سے علی گڑھ تک سفر کا اتفاق ہوا، احقر اس وقت علی گڑھ میں زیر تعلیم تھا، مولانا کے ساتھ ان کے ایک دو خادم بھی تھے۔ اس وقت دیکھا کہ ہر خوانچہ فروش سے مولانا کچھ نہ کچھ خریدتے، خود کھانے کے لیے نہیں، بلکہ رفقائے سفر کو کھلانے کے لیے، بعد میں معلوم ہوا کہ حضرت والا کی یہ مستقل عادت ہے کہ سفر کے وقت ٹرین میں ہر بیچنے والے سے کچھ نہ کچھ خریدا کرتے ہیں، شاید اس میں رفقاء کی دل جوئی کے علاوہ ان خوانچہ فروشوں کی اعانت کا بھی جذبہ کارفرما ہو۔

درس وتدریس کے سلسلے میں مولانا جہاں بھی رہے، وہاں سے ان کو تعلق خاطر رہا۔ مئو میں چونکہ ان کا طالب علمی اور پھر مدرسی کا ایک خاصا عرصہ گزرا ہے، اس لیے اس سرزمین سے ان کو خاص اُنس ولگاؤ تھا۔ دیوبند میں احقر کی طالب علمی کے زمانے میں یا اس کے بعد جب بھی کسی موقع سے حاضری ہوئی ہے، تو مولانا نے مئو کا ذکر چھیڑا ہے، اور یادوں کے دریچے کھولے ہیں، زندگی کے یادگار ایام کے ذکر کے ساتھ ساتھ یہاں کے اپنے متعلقین اور شناساؤں کے بارے میں پرسش احوال کرتے رہے ہیں۔

راقم سطور پر حضرت مولانا کی نگاہ خاص تھی، اور جب کبھی خدمت میں حاضری ہوئی مولانا کی عنایت اس سیہ کار پر مبذول رہی، فراغت کے بعد دیوبند میں جب جب حاضر خدمت ہوا مولانا کی ضیافت اور خورد نوازی سے ضرور بہرہ مند ہوا۔ المآثر اور حضرت محدث الاعظمی ؒ کے علوم کی خدمت کے سلسلے میں عاجز کی حقیر کاوشوں کی تحسین آمیز انداز میں حوصلہ افزائی کرتے۔ انتقال سے صرف پندرہ دن پہلے احقر کا دیوبند کا سفر ہوا، تو حضرت والا کی خدمت میں المآثر کا تازہ شمارہ پیش کیا، دیکھ کر خوش ہو گئے اور تعریف کرتے ہوئے فرمایا کہ چونکہ یہ ایک علمی رسالہ ہے، اس لیے اس کا مجھے خصوصیت سے انتظار رہتا ہے، تاہم ڈاک کی خرابی کی وجہ سے سارے شمارے مل نہیں پاتے۔

یہ احقر کی خوش بختی ہے کہ دیوبند کے اس سفر میں اس نے جھجکتے ہوئے مولانا سے حدیث شریف کی اجازت کے لیے درخواست کی، انھوں نے فرمایا کہ تم تو مجھ سے پڑھے ہوئے ہو، تم کو تو اجازت ہے ہی، عرض کیا کہ خصوصی اور عام اجازت چاہتا ہوں، مولانا نے از راہ عنایت اوائل اور مسلسلات کی اجازت کے علاوہ عام اجازت بھی عطا فرمائی، اسی موقع پر فرمانے لگے کہ ''اوائل'' کی اجازت تم کو کیوں نہیں دوں گا، اس کی اجازت تو مجھے تمھارے نانا مرحوم سے حاصل ہے، پھر کچھ اور

مہمان بیٹھے تھے، ان سے احقر کی نسبت کا تعارف کرتے ہوئے فرمایا کہ ''اوائل'' کی اجازت مجھے حضرت مولانا نے مکہ مکرمہ میں مدرسہ فخریہ میں عطا فرمائی تھی۔

یہ حضرت الاستاذ سے آخری ملاقات تھی۔ کسے معلوم تھا کہ اس کے صرف پندرہ دنوں بعد وہ اپنے آخری سفر پر روانہ ہوجائیں گے۔ اللہ رب العزت ان کی مغفرت فرمائے، ان کی قبر کو جنت کا باغ بنائے، اور لغزشوں سے درگزر فرمائے، اور پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق عنایت فرمائے۔

جان کر منجملۂ خاصان میخانہ تجھے   مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ تجھے

....

مولانا محمد اسلام صاحب

۲؍محرم ۱۴۳۸ھ مطابق ۴؍اکتوبر ۲۰۱۶ء فجر کی نماز سے چند لمحے قبل مفتی جاوید احمد صاحب کے فون سے یہ افسوسناک خبر وصول ہوئی کہ تبلیغی جماعت ضلع مئو کے امیر مولانا محمد اسلام قاسمی کا وصال ہوگیا، إنا للہ وإنا إلیہ راجعون۔ انتقال کے وقت عمر عزیز تقریباً پچاسی سال تھی۔ اسی دن ظہر کی نماز کے بعد جنازہ ہوا اور آبائی قبرستان میں مدفون ہوئے۔

مولانا مرحوم مئو میں تبلیغی جماعت کی آبیاری کرنے والوں میں تھے، یہ ان لوگوں میں سے تھے جو جماعت کے کام کی ابتدا سے اس کے لیے محنت، جد وجہد، لوگوں سے ملاقات اور اس کی اشاعت کی فکر میں کوشاں اور مصروف رہے۔

ان کی ولادت ۱۳۵۳ھ مطابق ۱۹۳۴ء یا ۱۹۳۵ء میں ہوئی، ابتدائی اور عربی دوم تک کی تعلیم اپنے وطن میں حاصل کی، اس کے بعد الہ آباد چلے گئے، اور متوسطات تک پڑھنے کے بعد دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا، اور حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ سے بخاری شریف اور دیگر اساتذہ سے دوسری کتابیں پڑھ کر ۱۹۵۶ء میں فارغ التحصیل ہوئے۔

فراغت کے بعد واطن واپس ہوئے، دارالعلوم مئو میں چند سال درس وتدریس کی خدمت انجام دی، اور عربی درجات میں متوسطات تک کی کتابیں پڑھائیں پھر یہ سلسلہ منقطع ہوگیا، آخر میں ان کو دارالعلوم کی کمیٹی کا صدر منتخب کیا گیا، لیکن کچھ ہی عرصے بعد انھوں نے اس سے سبکدوشی اختیار

کرلی۔ پڑھانے کے زمانہ میں تو مولانا سے بہت سے لوگوں نے پڑھا ہوگا اوران کے درس سے فائدہ اٹھایا ہوگا، لیکن مولانا محمد انظر صاحب قاسمی استاذ مدرسہ مرقاۃ العلوم کے بیان کے مطابق ان کے تلامذہ میں نمایاں نام مولانا نور عالم خلیل امینی استاذ دارالعلوم دیوبند وایڈیٹر ماہنامہ الداعی (عربی) کا ہے۔

مولانا مرحوم دیندار اور پرہیز گار ہونے کے علاوہ متواضع، سادگی پسند اور ملنسار وشریف انسان تھے، مزاج میں خاکساری اور فروتنی تھی، چھوٹوں پر شفقت اوران کے ساتھ محبت کرتے تھے۔ راقم نے مولانا کو اپنے بچپن سے دیکھا ہے، ان کے ہمارے پورے گھر، خصوصاً میرے بڑے والد حاجی خلیل احمد صاحب -متوفی ۲۰۰۵ء- اور میرے والد صاحب سے بہت خاص اور گہرے تعلقات تھے، چونکہ احقر کا غریب خانہ مرکز تبلیغی جماعت کے بالکل سامنے ہے، بلکہ یہیں سے مئو میں جماعت کے کام کا آغاز ہوا ہے، اس لیے مولانا کی تقریباً ہر جمعرات کو بلکہ اس کے علاوہ دوسرے دنوں میں بھی آمد ورفت ہوتی رہتی تھی، ان کی رحلت سے تبلیغی جماعت کے اولین لوگوں کی صف خالی ہوگئی، خدا سے دعا ہے کہ ان کے انتقال سے واقع ہونے والے خلا کو پُر فرمائے۔

ان کے چچا قاری محمد مصطفیٰ صاحب مئو کے مشہور قاری تھے، مولانا نے ان سے قراءت سیکھی تھی، وہ مرکز میں آتے تو کبھی کبھی نماز کی امامت بھی کیا کرتے تھے، فجر یا عشاء کی نماز پڑھاتے تو بہت پرسوز اور دل گداز آواز میں قرآن کی تلاوت کرتے۔

اللہ رب العزت ان کی مغفرت فرمائے، درجات بلند فرمائے اور پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق عطا فرمائے۔

....

اہلیہ مولوی ایمن اعظمی

۹؍ربیع الاول ۱۴۳۸ھ = ۹؍دسمبر ۲۰۱۶ء کو حضرت محدث الاعظمی رحمۃ اللہ علیہ کے پوتے اور حاجی سعید احمد صاحب مرحوم کے بیٹے مولوی ایمن صاحب کی اہلیہ کا طویل علالت کے بعد انتقال ہوگیا، إنا للّٰہ وإنا إلیہ رجعون. جمعہ کے دن نماز جمعہ کے بعد اور عصر سے کچھ پہلے ان کی روح نے قفس عنصری سے پرواز کی، اور اسی دن عشاء کی نماز کے بعد آبائی قبرستان واقع لب دریا تدفین عمل میں آئی۔

یہ ان کے پورے گھر کے لیے بڑا المناک اور جانکاہ حادثہ ہے، خصوصاً جب کہ اس گھر کے سرپرست اور ہمارے چھوٹے ماموں حاجی سعید احمد صاحب کی وفات کو ۴؍مہینے کا بھی وقت نہیں گزرا ہے، کہ یہ حادثہ پیش آ گیا، اللہ تعالیٰ مرحومین کی مغفرت فرمائے، اوران کی خطاؤں اور لغزشوں سے درگزر فرمائے، اور کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے، آمین۔

مرحومہ تقریباً ۱۵؍برس سے جوڑوں کے درد کی بیماری میں مبتلا تھیں، یہ بیماری اتنی بڑھ گئی تھی کہ ان کے لیے خود سے اٹھنا بیٹھنا مشکل تھا، مگر انھوں نے اس طویل المدت بیماری کے باوجود صبر وشکر کا دامن کبھی ہاتھ سے نہیں چھوڑا، صوم وصلوٰۃ کی ہمیشہ پابند رہیں، ان کے شوہر نے اس طویل بیماری میں ان کی جس طرح دیکھ ریکھ نگہداشت اور علاج ومعالجہ کیا ہے، وہ ایک مثالی عمل ہے۔

مرحومہ کے پسماندگان میں دولڑکے اور دولڑکیاں ہیں، اللہ جل شانہ سے دعا ہے کہ تمام پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق عنایت فرمائے، اور والدہ کے حق میں دعا وایصال ثواب کی توفیق مرحمت فرمائے، آمین۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

☆☆☆☆☆☆

صفحہ ۸۰ کا بقیہ

جس شخص نے حج نہیں کیا اسے حج ہی کے لیے رقم جمع کرنی چاہئے، لیکن اگر حج فرض کر چکا ہے تو اب عمرہ پر اکتفاء کرنا درست ہے۔(فتاویٰ عثمانی ج ۲،ص ۲۱۳)

اگر کسی پر حج فرض ہو چکا ہے مگر وہ حج نہیں کرتا اور عمرہ کرتا رہتا ہے تو ایسے آدمی کا عمرہ تو شرعی طور پر صحیح ہو جائے گا لیکن حج میں تاخیر کرنے کی وجہ سے سخت گنہگار ہوگا اور اگر خدانخواستہ اسی حالت میں حج کرنے سے پہلے مرجاتا ہے تو سخت عذاب کا مستحق ہوگا، اس لیے سب سے پہلے حج کرے اس کے بعد موقع ملے تو عمرہ کرتا رہے۔ (انوار مناسک ص ۳۱۹)

عمرہ کرنا سنت موکدہ ہے حدیث سے اس کی فضیلت ثابت ہے، اس سے انکار نہیں ہے، جس پر حج فرض نہ ہو وہ عمرہ کرے یا جو حج کر چکا ہو وہ عمرہ کرے۔ واللہ اعلم بالصواب

جس پر حج فرض ہو جائے اس کا حج سے پہلے عمرہ کرنا

از: مفتی جاوید احمد صاحب قاسمی
مدرسہ مرقاۃ العلوم، مئو

آج کل کثرت سے یہ ہو رہا ہے کہ بہت سے لوگ حج فرض ہونے کے باوجود حج نہ کرکے صرف عمرہ کرتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ ابھی تو عمر بہت باقی ہے پہلے حرمین شریفین کی زیارت کرلیں پھر حج کرلیں گے ابھی سے لوگ حاجی صاحب کہنے لگیں گے، داڑھی رکھنا پڑے گا وغیرہ۔ یہ سب غلط خیالات ہیں، عمرہ کر لینے کے بعد حج میں سستی ہو جاتی ہے، پھر یہ بھی یقین نہیں کہ آئندہ مال باقی رہے یا نہ رہے۔ بہت سے لوگوں کو دیکھا گیا کہ بعد میں وسعت ہی ختم ہوگئی، لہٰذا اگر کسی پر حج فرض ہو چکا ہو تو فوراً بلا تاخیر حج کرنا فرض ہے، تاخیر سے سخت گنہگار ہوگا۔ اس لیے کہ حج ارکان اسلام میں سے ایک اہم رکن ہے اور فرض ہے، قرآن کریم میں ہے: وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلاً وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ (سورہ آل عمران) اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لیے لوگوں پر حج بیت اللہ فرض ہے جس شخص کو وہاں تک پہنچنے کی استطاعت ہو، اور جس نے انکار کیا تو اللہ تعالیٰ بے شک تمام جہانوں سے بے نیاز ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص ایسے توشۂ سفر اور سواری کا مالک ہو جو اس کو بیت اللہ تک پہنچا دے، پھر بھی وہ حج نہیں کرتا ہے تو اس بات میں کوئی فرق نہیں کہ وہ یہودی یا نصرانی ہو کر مرے۔ **عن علي قال: قال رسول الله ﷺ من ملک زادًا أو راحلةً تبلغه إلى بيت الله ولم يحج فلا عليه ان يموت يهودياً أو نصرانياً وذلک ان الله يقول فى كتابه ولله على الناس حج البيت من استطاع اليه سبيلاً** (ترمذی ج۱، ص۱۰۰)

حج میں تاخیر کرنا مکروہ تحریمی ہے، اگر سالہا سال تاخیر کرے تو فاسق ہوگا اور اس کی شہادت

قبول نہیں کی جائے گی، علی الفور فی العام الاول عندالثانی وأصح الروایتین من الامام ومالک وأحمد فیفسق وترد شهادته بتاخیره أی سنیناً لأن تاخیره صغیرة وبارتکابه مرة لا یفسق إلا بالاصرار.......... فیکون التاخیر مکروهاً تحریماً (الدر المختار مع رد المحتار ج۳، ص۴۵۴)

فتاویٰ عالمگیری ج۱، ص۲۱۶ میں ہے کہ حج فرض ہے فوراً اور یہی اصح ہے، پس جائز نہیں ہے آئندہ سال تک تاخیر کرنا وهو فرض علی الفور وهو الاصح فلا یباح له التاخیر بعد الامکان الی العام الثانی کذا فی خزانة المفتین.

جس آدمی پر حج فرض ہوا اور وہ اپنا حج فرض چھوڑ کر دوسرے کا حج بدل کرے تو اس کے لیے یہ مکروہ تحریمی ہے، جب حج بدل کا یہ حکم ہے تو ظاہر ہے کہ حج فرض چھوڑ کر عمرہ کرنا بدرجہ اولیٰ مکروہ تحریمی ہوگا۔ والافضل إحجاج الحر العالم بالمناسک الذی حج عن نفسه وذکر فی البدائع کراهة إحجاج الصرورة لانه تارک فرض الحج ثم قال فی الفتح بعد ما اطال الاستدلال والذی یقتضیه النظر أن حج الصرورة عن غیره ان کان بعد تحقق الوجوب علیه بملک الزاد والراحلة والصحة فهو مکروه کراهة تحریم لأنه تضیق علیه فی أول سنی الامکان فیا ثم بترکه (شامی ج۴، ص۲۱)

حضرت مولانا مفتی عبدالرحیم صاحب لاجپوری علیہ الرحمہ نے لکھا ہے صحیح یہ ہے کہ جس سال حج فرض ہوا اسی سال حج میں جانا ضروری ہے بدون عذر شرعی تاخیر کرنے سے گنہگار ہوتا ہے۔
(فتاویٰ رحیمیہ ج۴، ص۱۶۹)

حضرت مولانا یوسف صاحب لدھیانوی علیہ الرحمہ نے لکھا ہے جس شخص کو ایام حج میں بیت اللہ تک پہنچنے اور حج تک وہاں رہنے کی طاقت ہو اس پر حج فرض ہو جاتا ہے اور یہ فرضیت اس پر ہمیشہ قائم رہتی ہے، اس لیے ایسے شخص کو جو صرف ایک بار بیت اللہ شریف تک پہنچنے کے وسائل رکھتا ہے حج پر جانا چاہئے عمرہ کے لیے سفر کرنا اور فرضیت کے باوجود حج نہ کرنا بہت غلط بات ہے۔
(آپ کے مسائل اور ان کا حل ج۵، ص۲۴۱)

حضرت مولانا محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم نے لکھا ہے بقیہ صفحہ ۸۷ پر